

سفینہ اور نور

میر اشیعیں

انہی دنوں علی پور میں میرا شنوں کا ایک نیا ٹولہ آیا تھا۔ ان میں ایک میرا شن زہرہ غصب کی رسائل تھی۔ جب وہ گاتی اس کا حیہ ہی بدلتا جاتا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت چھا جاتی ایسی کیفیت کہ دیکھنے والے بہوت ہو کر رہ جاتے۔ محلے کے جوان بیچارے انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی بہانہ ہاتھ آئے تو وہ میرا شنوں کو بلا میں اور چھپت پر چاندنی بیٹھ کر زہرہ کو گاتے دیکھیں۔ کوئی طرف عورتیں بیٹھ جاتیں۔ وہ میان میں میرا شنوں کے لیے جگہ مقرر کر دی جاتی۔ دوسری طرف محلے کے جوان بیٹھ کر زہرہ کی طرف متسم نگاہوں سے دیکھتے۔ جب وہ عورتوں کی طرف دیکھتی تو اس کے چہرے پر مردی چھائی ہوتی۔ لیکن جب وہ جوانوں کی طرف آنکھاٹھائی تو دفعتاً گویا سوکھا ہوا پھول از سر نوتازہ ہو جاتا اس پر جوانوں کے ہاتھ چپ چاپ جیبوں میں کچھ ٹوٹنے لگتے۔ زہرہ کے ساتھیوں کے چہروں پر صرت کی لہر دوڑ جاتی اور ان کی تانوں میں جوش پیدا ہو جاتا۔ محلے کی عورتیں میرا شنوں کو پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں کہ ان کے آنے سے محلے میں رونق کی لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریب میں چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر نوجوانوں کا مسکرا کر زہرہ کی طرف دیکھنا اور روپے پر روپے دیتے جانا انہیں بے حد ناپسند تھا۔

محلے میں صرف چند ایک لوگیاں ایسی تھیں جو محلے کی عام عورتوں کے بر عکس ایسے موقع پر خوش دکھائی دیا کرتی تھیں ان میں شہرا و پیش پیش تھی۔ ڈھولک کی آوازن کراس کی آنکھوں میں گلابی چینی اڑنے لگتے شانوں پر ریشمیں دو پٹے جا سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بازو یوں بات بات پر لہراتے جیسے کھاکلی کے مندر ادا کر رہی ہو۔ اس کی تو آواز بھی بدلتا تھی۔ گلے کے سر چڑھ جاتے اور بات میں تھا۔ لوچ پیدا ہو جاتا۔

ہرنی ہے ہرنی

شہزاد کی اس بات پر محلہ والیوں میں چہ میگویاں ہوتیں۔ دبی دبی آوازیں سنائیں دیتیں۔

”آخر خاندان کا اثر نہیں جاتا بہن۔“

”خود بھی تو گاتی ہے۔ سنا تھا۔ جب دوہن بن کر آئی تھی خود اسی اپنے بیاہ پر گانے لگی تو بذرانہ بھجکی۔“

”میں کہتی ہوں چاچی یہ چیزیں خون میں ہوتی ہیں ہاں کہے دیتی ہوں۔“

”سچ کہتی ہو بیٹی نہ زمانے کو دیکھ کر حرمت ہوئی ہے۔“

”ابھی تو دیکھتی جاؤ چاچی۔ ابھی دیکھا گیا ہے۔“

”نہ اللہ نہ کرے۔ اب تو خدا اٹھا آئی لے تو اچھا ہے۔ بہن۔“

”تو بہہ تو ان منحوں پر بچھے جاتے ہیں۔“

جب سے شہزاد محلے میں آئی تھی۔ محلہ والیاں اسے حیرانی سے دیکھتی تھیں اور منہ میں انگلی ڈال کر کھڑی کی کھڑی رہ جاتیں۔ مگر شہزاد نے کبھی اس تفصیل کو اہمیت نہ دی تھی۔ اسے محسوس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہیں اور اس کی حرکات کا بغور جائزہ لیتی ہیں۔

وہ چلتے چلتے چاچی کی طرف دیکھ کر شور مچا دیتی۔ ”سنا چاچی کس کا انتظار کر رہی ہے۔ فکر نہ کرو اب آتے ہی ہوں گے۔ چچا۔“ اور پیشتر اس کے کہ چاچی جواب دیتی وہ اس کے پاس سے نکل جاتی اور کسی اور سے جا کر بات کرنے لگتی۔

”بابا عمرہ ہیں۔ سلام کہتی ہوں بابا۔ نماز پڑھ کر آئے ہو۔ یہ کس وقت کی نماز ہوئی۔ دن میں ان نمازوں پڑھتے ہو کیا۔“ اور پیشتر اس کے کہ بابا کچھ کہیں وہ کسی بچے سے بات شروع کر دیتی۔

شہزاد کی عادتیں انوکھی تھیں جو محلے والیوں کی نگاہوں میں کھلکھلتیں مگر اس کی نہ مکھ

طبعت کی وجہ سے۔

رفیق اور سکینہ

محلہ والیاں خاموش رہتی تھیں۔ پھر بھی دبی دبی رہنے کے باوجود بات نہ دبی اور محلہ والیوں کی سرگوشیاں جاری رہیں۔ ہر فلی ہے ہرنی۔ وہ اسے دیکھ کر کہتیں۔ دکلیں بھرتی ہے۔ شاید اس لیے کامیل شہزاد کے متعلق سرگوشیاں کرنا آسان نہ تھا۔ جب تک دو نام فسلک نہ ہوں سرگوشیوں میں لذت پیدا نہیں ہوتی۔

اس لئے آہستہ آہستہ ان سرگوشیوں میں شہزاد کے ساتھ رفیق کا نام شامل کر لیا گیا اور محلہ والیاں رفیق کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ شاید رفیق کی طرف انکیاں نہ اشتبہیں بلکہ مشکل تھیں کہ رفیق کی شادی جوچکی تھی اور وہ بچپن ہی میں سکینہ کا خاوند بن چکا تھا جو اس کی ہر حرکت پر لڑائی نگاہ رکھتی تھی اور اس کی ہر جنبش میں مقصد ڈھونڈتی تھی۔ رفیق کی آنکھوں میں بوند باندی ہوتی دیکھ کر اس کے پیروں میں عطر کی خوبی محسوس کر کے وہ ایک گہری سوچ میں پڑ جاتی۔

رفیق اور سکینہ ایک قدامت پسند گھرانے کے افراد تھے۔ خاوند بیوی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے بھی انہیں بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا اور پھر موقعہ اور محل کو دیکھنا پڑتا۔ رفیق کو رومال دھلوانا ہوتا تو وہ رومال پکڑ کر چھٹ کی طرف گھورتے ہوئے یوں گلنگتا جیسے کوئی منظر پڑھ رہا ہو۔ ”میں کہتا ہوں اسے دھوڑنا آج۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سکینہ کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھتا اور چوہبھی کے قریب بیٹھی ہوئی، سکینہ ہندیا میں جھانکتے ہوئے گلنگاتی ”رکھ دیجئے۔“ پھر رفیق رومال کو جھاڑ کر یوں گرا دیتا جیسے مداری تماشا دکھار رہا ہو۔ پھر وہ باہر نکل جاتا اور سکینہ لمبا گھونگٹ سنجا لے آتی اور گراہوا رومال اٹھا لیتی اور اس کی سمت قطعی طور پر نہ دیکھتی۔ جس سمت کو رفیق گیا ہوتا۔ ان حالات میں سکینہ اپنے شوہر کو پنجی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کرہی کیا

سکتی تھی۔ اس کے بر عکس رفیق شہزادے سراٹھا کر ملتا تھا۔ اگرچہ بات عزت سے کرتا تھا۔ لیکن اس کا بہانے بہانے شہزادے ملنا ”چھپ کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ چھپ ایسے اچھے چاول آئے ہیں۔ بنواری لال کی دوکان پر منگوانے ہیں کیا۔ چھپ چائے سستی ہو گئی ہے۔“ چھپ اپنے منڈی میں آیا ہے۔“

دن میں رفیق دوبار شہزادے کی طرف جاتا اور پھر دری تک آہستہ آہستہ اس سے باقیں کرتا رہتا اور باتوں کے دوران میں سی سی کرنے کے علاوہ جھگجھتا اور کھبر اگھر اکراہر ادھر دیکھتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے پھبھڑیاں چلتیں اور کانوں پر سرخ چیزوں پر ٹکتیں۔ رفیق کی بیوی سیکنڈ اسے شہزادے کی طرف آتے ویکھ کر اپنے لمبے گونگٹ سمیت کوٹھے پر چڑھاتی اور ان کی طرف ہرگزی چھت یا طاق سے چوری چوری جھائختی۔ انہیں قریب قریب کھڑے دیکھ کر رفیق کے متعلق نہ جانے کیا کیا اندازے لگاتی۔ پھر اسکیلے میں بیٹھ کر آنسو بھاتی اور محلے والیاں اسے اداں دیکھ کر چمیگوئیاں کرتیں اور ان کی سرگوشیوں میں رفیق اور شہزادے کے نام سنائی دیتے۔

ایلی نے بھی کئی ایک بار انہیں یوں قریب کھڑے باقیں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور خواہ مخواہ اس کے دل میں بھی جلن پیدا ہوئی تھی۔ پھر تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا رہا تھا۔ ”رفیق اثر پیدا کر سکتا ہے تو کیا ہے۔“ اس نے لا حول پڑھ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن یہ تو اس زمانے کی بات تھی جب اسے تسلیم سے محبت نہ ہوئی تھی۔ اب تو جب بھی وہ شہزادے کی طرف دیکھتا تو اس کی نگاہوں میں شہزادے کے خدو خال دھند لے پڑ جاتے اور اس رنگیں دھند لکے میں سفید و ہبے چمکتے اور گھنٹھریا لے بالوں کی لٹاٹھراتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ شہزادے نہیں بلکہ تسلیم ہو جیسے تسلیم نے بھیں بدل رکھا ہو۔

علی پور کے ان مشاصل میں ایلی کی چھپیاں گویا چشم زدن میں ختم ہو گئیں۔ اور وہ علی پور سے امر تر چلا آیا کانج جانے سے پہلے وہ آصف کے گھر گیا اور دیر تک اسے آوازیں دیتا رہا بالآخر ان کا نوکر بیچ آیا۔ ”آصف صاحب ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”جی میں دیکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“ آصف نے تو کبھی ایسا نام کیا تھا۔ جب بھی ایلی اس نگل میں کھڑا ہو کر آواز دیتا تو کھڑکی سے آصف جھانکتا اور مسکرا کر کہتا۔ ”آیا بھی۔“ اس سے پہلے نوگرنے کبھی بیچ کر رہا تھا۔ ”جی میں دیکھتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے۔“

نوکر دوسرا بار آیا۔ ”جی آئیجے۔“ وہ بولا۔ وہ اسے بیٹھک میں لے گیا۔ ”بیٹھنے وہ بھی آتے ہیں۔“ وہ بیٹھک بہت ہی محض سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں پنگ پڑا تھا اور دوسری جانب ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، دو بڑی کھڑکیاں اور روشنداں میں مکھتے تھے۔ ایلی نے آصف کی بیٹھک کو دیکھ کر محسوس کیا جیسی وہ بدلتی سی ہو۔ پہلے تو اس میں اتنا اندر ہیرانہ ہوتا تھا نہ ہی وہ اس قدر ویران تھی۔ پہلے روشنداں میں شیشے لگئے ہوئے تھے لیکن اب ان پر ناث لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد آصف داخل ہوا اس کا چہرہ زرد تھا آنکھیں روئی روئی نظر آتی تھیں اور انداز میں جھجک تھی۔ ایلی کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے حد ادا اس تھی۔

”تم آگئے۔“ وہ بولا۔ ”میں محسوس کر رہا تھا کہ تم کبھی نہیں آؤ گے اور کانج ہمیشہ بند پڑا رہے گا اور..... اور.....“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”تم بیمار ہو کیا؟“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔ ہاں بیماری سمجھ لو۔“ وہ بولا۔

”کیا تکلیف ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تکلیف۔“ آصف مسکرا یا۔ ”تکلیف نہیں روگ لگا ہے۔“ وہ ایلی کے قریب تر ہو کر زیر لب با تین کر رہا تھا۔ جیسے اپنی آواز سے ڈر رہا ہو۔

”آخر بات بھی تو بتاؤ نا؟“ ایلی نے جیخ کر کہا۔

آصف گھبرا گیا۔ ”خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔“

”کون سن رہا ہے تمہاری بات۔“ ایلی نے پوچھا۔

”سن رہا ہے۔ سن رہا ہے۔“ اس نے روشن دانوں کی طرف اشارہ کیا۔

عین اس وقت گلی میں کسی نے قیچہ لکھا۔ ایلی چونکا۔ ”یہ کون، نہیں رہی ہے؟“

”چلو یہاں کے چیلیں۔“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”میکن ایسے نہیں تم پہلے جاؤ میں آ جاؤں گا۔ بازار میں ملوں گا۔ جلد ہی کرم جلد ہی۔“

اس کارنگ ہلڈی کی طرح زردوہ رہا تھا۔ ”کھڑکی کھول دو۔“ قریب ہی سے پھر وہ عجیب غریب آواز آئی۔

”یہ ہے کون؟“ ایلی نے پوچھا۔ آصف کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ ہونٹ کا پنت لگے۔ ”خدا کے لیے بازار میں میرا انتظار کرنا۔ شاید مجھے دیر ہو جائے۔“

عین اس وقت ایک ڈبل ایٹھ روشنداں کے ناث سے ٹکرایا کر دھڑام سے گلی میں گری۔

باہر نکلتے ہوئے ایلی نے چوری چوری ایک نظر مقابل کے چوبارے میں ڈالی۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”اس سے کہو باہر نکلے۔“ وہ چلا گی۔

ایلی ڈر کر بھاگا کہ کوئی ایٹھ اس کے سر پر نہ گر جائے۔

کوئی نہیں کسی سے نہیں

بازار میں وہ دیر تک ٹھلٹا رہا مگر آصف نہ آیا اس کا جی چاہتا تھا کہ پھر سے گلی میں

داخل ہو جائے اور جا کر اسے آواز دے مگر جرأت نہ پڑتی تھی۔ نہ جانے وہ ایسٹ کس نے ماری تھی نہ جانے وہ اسے ڈانٹ کیوں رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور حالات کیا تھے۔ دیر تک وہ کھڑا سوچتا رہا اور پھر ان جانے میں اس نے اپنا رخ آغا کے گھر کی طرف موڑ لیا اور پھر جو اس نے زگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ تسلیم کی میڑھیوں میں کھڑا تھا۔ غیر از معمول اس نے دروازہ ٹکڑا کھایا۔ لیکن گھر گویا ویران پڑا تھا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ڈیورٹی زینہ اور بیٹھک سب ویران پڑے تھے۔ اس نے پھر دروازہ ٹکڑا کھایا۔ دور سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”کون ہے؟“ تسلیم کی آواز سن کر اس کے افہمان خطا ہو گئے۔ دروازے میں تسلیم کا سفید روپ نظر لیا اور پھر ایک ہفتہ تھا میں اپنے جملے۔ ”تسلیم۔“ ایلی نے ذریلہ کہا۔

”اوی اللہ۔“ وہ چلا کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر بٹنے لگی۔

”گھر کوئی نہیں۔“ وہ نہستی ہوئی بولی۔ اس کی فہمی میں واضح اشارہ تھا۔

”مجھے کوئی نہیں سے ملنا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کوئی نہیں۔ کسی سے نہیں ملتے۔“ وہ پھر فہمی۔

”ہاں ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”میں کسی سے نہیں ہوں۔“

”پڑے ہو۔“ وہ شک کر بولی۔ ”ہم کیا کریں۔“

”یہی تو بتانے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”کہ تم کیا کرو۔“

”نہ جی۔“ وہ کہنے لگی۔ ”ہمیں نہ بتائیے کچھ۔ ہم نہیں سنتے ایسی ولیسی بات۔ کہو کام کیا ہے؟“

”کام وہ آن پڑا ہے۔“ ایلی گلگنانے لگا۔ ”خدکے لیے ذرا دروازے میں تو آؤ۔“

”نہ میں نہیں آتی۔“

”ضروری بات ہے۔“ وہ ملتیں کرنے لگا۔

”پڑی ہو۔“ وہ بولی۔

ایلی نے دروازہ کھول دیا۔ ”اچھا تو میں آتا ہوں۔“ ”خدا کے لئے۔ خدا کے

لئے۔“ وہ چلائی۔ ”وہ آنے ہی وائے ہیں۔“

”تو پھر وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملوگی۔“ ایک فاتح کی طرح اس کی باچھیں کھل

گئیں۔

”ملنے سے مطلب ہے۔“ وہ بولی۔

”تمہیں دیکھنا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”دیکھا ہے۔“ وہ قہقہہ تار کر رہی تھی۔ ”دیکھ کر کیا لیں گے۔“

”کیا لینے دینے کے بغیر دیکھا نہیں جاسکتا۔“

”بس جی بس۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”اب جانے دو ورنہ۔“

”ورنہ۔“ وہ چلایا۔ ”میں اندر آ رہا ہوں۔.....“

”نہیں نہیں۔“ اس نے منت کی۔

”تو پھر ملنے کا وعدہ کرو جلدی۔“

”ملوں گی ہلوں گی۔“

”کب؟“

”کہہ جو دیا ملوں گی۔ جاؤ نا اب۔ جاؤ بھی۔“ وہ چڑ کر بولی۔

ایلی سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر وہ اوپر سے ایک ڈبل اینٹ مارے یا پتھر ہی سہی تو زندگی کتنی دلفریب ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے کوئی شرارت۔ کوئی شرارت۔ کوئی حرکت۔ جس سے زندگی زندگی بن جائے چاہے جو کچھ بھی ہو یہ سوچتا ہوا وہ چپ چاپ آموں کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

جونی وہ بورڈنگ میں پہنچا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اسے شانوں پر اٹھا کرنا پڑنے لگا۔ ایلی نے شور مچایا۔ نالگیں چلا گئیں۔ لیکن بے کار۔ اللہ داد نے اسے اٹھائے رکھا۔ "شفیع اوشفیع اب بن گئی بات۔ اب تو وہ باونڈری لگا گئیں گے کہ یہ مہاشے یاد کریں گے۔" شفیع کو تلاش کرنے کے بعد وہ دونوں ولیے ہی ایلی کو اٹھائے ہوئے جلوس کی صورت میں ہر کمرے میں گھومنے لگئے۔

"لو بھتی ہو جاؤ تیار ہر نام سیاں اور گوبند رام ذرا آ جاؤ میدان میں ہمارا پھو بھی پہنچ گیا ہے وہ باونڈری لگکی کہ یاد رکھو گے۔"

ہر نام سنکھنے کیلئے دیکھ کر موچھ مردی فلامگرو۔ وہ دعاڑنے لگا۔ "وہ ہتھ دکھاؤں گا کہ یاد کرو گے۔"

اللہ داد نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ "تو آ جاؤ میدان میں ہیرے یا رے۔"

پھر وہ رام گوپاں کے کمرے میں جا گھسے "نکل آ بے رامو۔" اللہ داد چلا یا۔ "دیکھیں گے آج تیرے ہاتھا بے مسلوں کے سامنے کیا ٹھہر و گے تم۔ آدم خور ہوتے ہیں ہاں۔"

رام گوپاں نے ایک نعرہ لگایا جے کالی ماتا جے بھرگ بی اور چھلانگ مار کر باہر نکل آیا۔

یونہی جلوس بڑھتا گیا۔ وہ ہر کمرے میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکل کر نعرے لگاتے اور لڑکوں کو نکال کر آگے چل پڑتے۔ سب سے آخر میں وہ بنگالی سپر بند ڈنٹ کے کمرے میں پہنچ۔

"علی..... مولا علی۔" اللہ داد نے نعرہ لگایا۔ بنگالی بابو گھبرا کر باہر نکل آیا اور لڑکوں کے جلوس کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ نے مضمکہ خیز صورت اختیار کر لی۔

"اے یہ کیا گڑ بڑ ہے بھتی۔" بنگالی بولا۔

"باہر نکلنے صاحب۔" لڑکے ایک زبان ہو کر چلا یے وقت ہو چکا ہے وہ مقابلہ

ہو گا آج کر ہتھی دنیا تک یاد رہے گا۔“

”وہ ہاتھ دکھاؤں گا صاحب کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“ رام گوپال چلا یا۔

”واہ گرو۔“ ہر نام سنگھ کی آواز گنجی۔

”علی۔ حیدر، اللہ داد چینے لگا۔“

”شورنہ مجاو۔“ بنا کالی بابو مسکرا نے لگا۔ ”چلو ہم آتا ہے۔“ لڑکے جانے لگا تو اس نے انہیں روک لیا۔

”دھڑرو۔“

”ہاں بھی یہ بنا کالی پر غنڈٹ نے کہا۔“ تم سب کو رو لوں کا کھبر ہے۔“

”مسلمانوں کو گوشت میکانے کی اجازت وکی جائے۔“ شفیع بولا۔

”نو۔ نو۔ نہیں نہیں۔“ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ”نہیں نہیں۔“

سپر غنڈٹ نے کہا۔ اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔“

”کچھ پرانہیں۔“ اللہ داد بولا۔ ”لیکن ہم تمین مسلمان ہیں۔ ہم مل کر مقابلہ

کریں گے۔ ہمارا حساب اکٹھا رکھا جائے۔ بعد میں تمین پر تقسیم کرو دیا جائے۔“

”نو۔ نو۔“ لڑکے چلا نے۔

”اس میں کوئی حرج نہیں۔“ سپر غنڈٹ بولا۔ ”ہرے۔ ہرے۔“ شفیع اور اللہ

دواو چینے لگے۔

”آدھ گھنٹے کے بعد مقابلہ شروع ہو جائے گا اب تیاری شروع کرو۔“ بنا کالی بابو نے کہا۔

مقابلہ

سپر غنڈٹ کی اس بات پر نعروں اور چنگلھاڑوں کے بعد جلوں بکھر گیا۔ اللہ داد

ایلی کوشانوں پر اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں آیا۔

”اے بے کیسا مقابلہ ہو گا۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔“ ایلی نے اللہ داد سے پوچھا۔

”ہائیں تمہیں معلوم نہیں کیا۔“ اللہ داد نے غصے میں وہم سے ایلی کو چار پانی پر پھینک کر پوچھا۔

”اے بدھو آج مسلمانوں کے امتحان کا دن ہے۔ آج انہیں کفار کو نیچا دکھانا ہے۔ بیٹا آج تمہیں ہماری لاج رکھنی ہے اگر مسلمانوں کے ہوتے ہوئے ”پیٹو“ کا خطاب کسی اور کوئی نہیں تو بھی کسی کو منہ دکھانے کے مقابل نہ رہیں گے۔“ اللہ داد بولا۔

”اتنا کھاؤ آج۔ اتنا کھاؤ کہ اس اسلامی پیٹ کے صحرائیں بندوں کے چھلکے ریت کے ذرے بن جائیں۔“ شفیع نے اپنا ادبی انداز لکھایا۔

”اے چھوڑو یہ صحراء بیڑا، اللہ داد بولا۔“ یوں کہو کہ اتنا کھاؤ اتنا کھاؤ کہ میز سے اٹھانے کے لیے چار آدمی بلائے پریں۔ یہ بنگالی بابو کیا یاد کرے گا سالا کہ مسلے کبھی آ کر ٹھہرے تھے بورڈنگ میں۔“

کالج کے بورڈنگ کی رسم کے مطابق ہر سال ایک مرتبہ کھانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ شام کے کھانے پر باہر میزیں لگادی جاتیں۔ تمام امیدوار اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ درمیان میں سپرنڈنڈنٹ کی کرسی رکھدی جاتی تاکہ وہ فیر اور فاؤں کا فیصلہ کر سکے۔

کچھ میں اس روز دو چار چھھے اچھے سالن پکائے جاتے۔ اتنی مقدار میں پکائے جاتے کہ امیدواروں کے لئے کافی ہوں کیونکہ مقابلے کے روز ہر امیدوار کوئی سالن طلب کر سکتا تھا۔ جب مقابلہ شروع ہو جاتا تو ہر امیدوار کے پاس دو لفڑی کھڑے ہو جاتے جو چھلکوں کی تعداد گنتے جاتے اور ہر نئے چھلکے پر آواز دیتے۔ ”رام گوپال بار ہوا۔“ ”لینا سیاں پندر ہوا۔“ اور درمیان میں بیٹھے ہوئے فتشی ہر امیدوار کے نام کے سامنے تعداد لکھتے جاتے۔ ان ریفریوں کے ساتھ مختلف پارٹیوں کے لڑکے کھڑے رہتے تاکہ تعداد لکھنے والے شرات نہ کریں اور ہر بے

ضابطی پر سپر غنڈٹ کو پکارا جاتا۔ ”پوائی آف شکایت لالہ جی۔“ جوڑکا اس مقابلے میں سب سے زیادہ پھلکے کھاتا اے ”پیٹ“ کا خطاب دیا جاتا اور گلے میں ہار ڈال کر اس کا جلوس نکلا جاتا۔ جس کے ساتھ مناسب قسم کے نعرے لگائے جاتے۔ مقابلے کے ون کے لئے باور پیچی بندو پہلے ہی پھلکے پکار کھاتا کہ پھلکوں کی کمی کی وجہ سے میچ میں خلل نہ پڑ جائے پھر مقابلے کے وقت بندو، رامو، ہرناہہ اور کرشا رسولی میں بیٹھ کر کپکے ہوئے پھلکے سینکنے میں مصروف ہو جاتے اور رامو۔ کھمیا اور بڈھاچو کیدار باہر میزوں پر چیزیں مہیا کرنے کے لئے تیار رہتے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ رسولی کی کھڑکیوں اور لاوزروازوں سے پھلکوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور ایلی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے رسولی اور میزوں کے درمیان سفید کبوتر اڑ رہے ہوں۔ ”بندو پھاکا“ ہر نام سنگھ چینتا۔ ”آٹھ“ اس کے سر پر کھڑا ریفری چلاتا اور پھر ادھر سے رام گوپال شور مچا دیتا۔ ”بندو ادھر، پندرہ، بندو“ پھلکی، اللہ داد چینتا ساتھ ہی شفع اور ایلی چھینتے لگتے۔ ”پھلکاری پھلکاری۔“ ”ستاسٹھ۔ ستاسٹھ۔“ کی آوازن کر روم گوپال چونک جاتا۔ ارے پھر دھلتا سے یاد آتا کہ اللہ داد شفع اور ایلی کے پھلکوں کا حساب اکٹھا ہو رہا ہے۔ اور ستاسٹھ کا مطلب تھاستا سٹھ بٹا قیمن یعنی بائیکس فی کس۔ اسی قسم کی چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ چاروں طرف سے شباباش رام گوپال اشکے اونے ہر نامے۔ علی حیدر کے نعرے گونج رہے تھے اور ہر لحظہ سکور بڑھتا جا رہا تھا۔ مقابلے میں صرف سات امیدوار تھے۔ رام گوپال، ہر نام سنگھ، امرت لال، گوچرن سنگھ، ان کے علاوہ مسلمانوں کا ایک گروپ تھا۔ جس میں اللہ داد شفع اور ایلی تھے۔ صحن میں پانچ چھ میزوں گلی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر امیدواروں کے سروں پر ریفری اور اڑ کے کھڑے گنتی میں مشغول تھے۔ درمیان میں چھڑکے سکور کی حیثیت سے حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جن کے پاس ہی آ رام کری پر بنگالی بابو سپر غنڈٹ بچ کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔

”ایک سوتاون۔“ مسلمانوں کے گروپ کے ریفری نے آواز دی۔

”علی حیدر۔“ اللہ داد چلایا۔ ”بندو چنی۔“

”پوائیٹ آف آرڈر۔“ رام گوپال کھڑا ہو گیا۔ ”سپرنئنڈنٹ صاحب اللہ داد
صرف چنی کھار ہا ہے۔“

”علی حیدر۔“ اللہ داد دیوار نے لگا۔ چاروں طرف شور مجھ گیا۔

”بھروسہ بھروسہ۔“ بیس رجی بولے۔ ”چنی پر کوئی پابندی نہیں۔“

”علی حیدر۔“ اللہ داد غریباً لورام گوپال میز سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے
جانے کے بعد شفیع اور اللہ داد دیر تک چکھاڑتے رہے پھر آہستہ آہستہ گوچر نے
بھی ہاتھ روک لیا اور سب سے آخر میں ہر نام سنگھ کی طبیعت ماش کرنے لگی۔ ”علی
حیدر۔“ تینوں مسلمان ہیر و ایک سوتاون پر اٹھ بیٹھے اور بورڈنگ والوں پر گویا اوس
پڑھنی۔

”اجی یہ فاؤں ہے یہ مسلکے چنی سے روٹی کھاتے رہے ہیں یہ اصول کے خلاف
ہے،“ لیکن ان کی ہربات پر اللہ داد ”علی حیدر“ کافرہ لگا کران کامنہ چڑھتا اتنا اور بیس رجی
مسکرا کر کہتے۔ ”چنی کھانا اصولوں کے خلاف نہیں۔“ اور اللہ داد پھر سے تازہ دم ہو
کر چنگھاڑتا۔ ”علی حیدر۔“

پیٹھیوں کا لقب تو انہوں نے حاصل کر لیا۔ لیکن رات بھر ان تینوں کی بری حالت
راہی۔ چار پاسیوں پر پڑے وہ دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اور پھر اللہ داد اٹھ بیٹھا اور
کان پر ہاتھ روک کر گانے لگا اور پھر دفتاً چلا کر بولا۔

”اوے یارو۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ نیند تو آج تمہارے
باپ کو بھی نہیں آئے گی۔ بیکار پڑے ہو۔ آؤ چلو امر و دوں کے باش سے امر و دوڑ کر
لامیں۔ بڑے ہاضم ہوتے ہیں۔ تمہاری قسم۔“

صحیح سویرے اللہ داد نے پرنسپل کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضور چھٹی لینے کا
نحو ہمارا ارادہ ہے۔ اور نہ چھٹی میں کوئی دلچسپی ہے از راہ کرم چار آدمی بھیج دیجئے جو
ہمیں اٹھا کر کالج لے آئیں۔

دوپہر کے وقت پرنسپل اپنی لینڈو میں تیار اس کے ساتھ آصف تھا ”بھیلو“، پرنسپل
بولا۔ ”مبارک ہو تمہیں۔ پیٹھ بولو کیا حال چال ہے تمہارا۔“ اللہ داد نے اٹھ کر ہاتھ
جوڑے ”حضور آپ کا دیا سب پچھے ہے صرف اتنی ارج ہے کہ چاروں کے لئے چار
آدمی مقرر کر دیئے جائیں جو تمہیں اٹھا کر گھما پھرا لیا کریں۔“ پرنسپل نے ایک قہقہہ
لگایا اور پھر ”شabaش! ویل ڈن!“ کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اواس شام

پرنسپل کے جانے کے بعد آصف نے ایلی کو اشارہ کیا۔ ذرا یہاں تک چلا
میرے ساتھ۔ اس وقت اللہ داد اور شیع اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے
ایلی پچکے سے آصف کے ساتھ چل پڑا۔ آصف کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی مگر مسکراہٹ میں تازگی نہ تھی۔ اسے ملتے ہی ایلی نے ایک
سانس میں کئی ایک سوال کروالے۔

”کل تم کیوں نہ آئے وہ کون تھی جس نے ڈبل ایئٹ ماری تھی۔ وہ تمہیں
گھورتی کیوں تھی۔ تم سبھے ہوئے کیوں ہو۔ کیا ہے تمہیں آصف بولو بھی نا۔“
لیکن آصف چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں پر کھیانی مسکراہٹ تھی اور
رنگ زرد ہو رہا تھا۔

پھر ایلی بھی خاموش ہو گیا اور دیر تک وہ دونوں درخت تلنے خاموش بیٹھے رہے۔
ہر چند میٹ کے بعد آصف ایلی کی طرف دیکھ کر بے بسی بھرے انداز سے مسکرا
دیتا۔

آخر وہ بولا۔ کہنے لگا۔ ”ایلی اگر میں زہر کھالوں تو تم براؤ نہ مانو گے۔“

”زہر۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟“

”یہ نہ پوچھو۔“ آصف نے کہا۔ ”اب زندگی بیکار ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔“

”اگر میں کہوں کھالوں کیا کھالوں گے تم۔“ ایلی نے شرارت سے پوچھا۔ ”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”کھالوں گا۔“

ایلی سوق میں پڑ گیا۔ آصف چپ چاپ نہر کے پانی کو گھورنے لگا۔ دو رکوئی رہٹ رو رہا تھا۔ سامنے ندی کا پانی گویا چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اردوگرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں پودے سر جھکائے کھڑے تھے اور وہ دونوں ہی خاموش بیٹھے تھے۔

وہ یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ سورج مغرب میں جاؤ بہا اور آسمان پر سرخ دریاں پھیل گئیں اور رہٹ رو رو کر چپ ہو گیا۔ کتنی اداں شام تھی وہ۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”ابھی تم زہر نہ کھاؤ۔“

”کیوں۔“ آصف نے پوچھا۔ ”کیوں نہ کھاؤ۔“

”بس ابھی نہیں کہہ جو دیا ہے میں نے۔“

”اچھا۔“ آصف نے آہ بھری۔ ”پھر میں کیا کروں۔“

”انتظار کرو۔“ ایلی بولا۔

اچھا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر بورڈنگ میں جانے کی بجائے شہر کو چل پڑا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔“

”اچھا۔“ ایلی بولا۔ ”کل پھر ملیں گے۔“

ساری رات ایلی سوچتا رہا کہ آصف زہر کھانے پر کیوں آمادہ تھا وہ کوئی بات تھی جس کی وجہ سے دلکش تھا۔ وہ لڑکی کون تھی وہ چلا کیوں رہی تھی اس روز آصف کو اس سے محبت تھی۔ پھر اس نے آصف کی بیٹھک پر اینٹ کیوں پھینکی تھی اور چلا کر کیوں کہا تھا۔ سامنے بلاؤ اسے اگر انہیں محبت تھی تو۔ لیکن محبت ایسے تو نہیں کی جاتی

محبت تھی تو پھر زہر کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا وہ سوچتے سوچتے سوگیا۔

آصف

آصف ایک خاموش اور شرمیلا نوجوان تھا۔ نہ جانے اس کی بے پناہ جا فوبیت کا کیا راز تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی خاموشی اور شرمیلا پن ہو یا شاید اس کا سفید رنگ جوکی جوکی آنکھیں اور رخساروں پر جھلکتی ہوئی سرخی کو اس سے کوئی تعلق ہو بہر صورت یہ امر مسلم ہے کہ محلے گئی لڑکیاں اس کی لئے بے قرار ہوتی ہیں۔ قرب و جوار میں رہنے والیاں بار بار کوئے پر چھپتیں کہ قبایل ایک نظر آصف کو دیکھنا نصیب ہو جائے۔ کئی ایک تو گھنٹوں کوئے پر گھلٹتی رہتیں یا جب کا لمح جانے یا وہاں سے لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ گلی کی کھڑکیوں میں آ ھڑکی ہوتیں۔ کئی ایک اسے چھپ کر دیکھتیں۔ کئی ایک ایسی بھی تھیں جو بے پرواں کے پردے میں اپنی نمائش کرتیں کہ ایک نظر آصف انہیں دیکھ لے اور چند ایک تو دیوانہ وار چھپتیں اٹھا لیتیں یا کھڑکیوں سے لکھتیں شوخ لڑکیوں نے کئی بار اعلانیہ طور پر اسے سلام بھی کئے تھے۔ اس کے علاوہ اعلانیہ بات بھی کی تھی۔ مگر گلی میں چلتے ہوئے آصف نے کبھی گردن نہ اٹھائی تھی۔ وہ چپ چاپ زمین پر نظریں گاڑے جلدی جلدی گلی میں سے گزر جانے کی کوشش کرتا تھا۔

کوئے پر اس کا رو یہ مختلف ہوتا تھا وہ اوپر چڑھتے ہی نیچی نظر سے چھتوں کا جائزہ لیتا اگر کوئی بزرگ صورت مرد یا عورت قرب و جوار میں نہ ہوتے تو وہ لڑکی پر بھر پور نظر ڈالتا اور پھر چپکے سے سامنے سے ہٹ جاتا غالباً اس کی یہ بھر پور نظر اس کی تمام تر مشکلات کی وجہ تھی۔

اسے لڑکیوں سے چپکی ضرور تھی۔ لیکن اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ والدین کیا سمجھیں گے نہ جانے والدین کو خوش کرنے کے لئے یا اپنے

زہد و تقویٰ کا رعب جمانے کے لیے۔ یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اپنی برتری کا عملی طور پر اظہار کرنا چاہتا ہو۔ چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو وہ اکثر کوٹھے سے اتر کر ماں کی طرف جاتا اور کسی نہ کسی لڑکی کی شکایت کرتا۔ ”دیکھ لو ماں آج اس نے مجھے سلام کیا ہے۔“ اور اس کی ماں نہ جانے کس غلط فہمی یا حماقت کی وجہ سے جھٹ توکر کو بھیج کر لڑکی کے والدین تک شکایت پہنچا دیتی۔

ایسی شکایت محلے کی کئی ایک لڑکیوں کے والدین تک پہنچ چکی تھی اور وہ سب آصف کی اس عادت سے نالائی تھیں۔ والدین تو پہلے ہی اپنی بچیوں کی معصومیت پر یقین رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ بحثتے ہیں کہ ان کی اپنی اولاد بے حد معصوم اور پاک باز ہے البتہ وہ مرسوں کے بچے اُنہیں گمراہی کی طرف راغب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ آصف کی ان شکایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں نے آنسو بہا بہا کر والدین کو یقین دلا دیا کہ ان کا کوئی قصور نہیں اور محلے والوں کے دلوں میں آصف کے خلاف بغضہ پیدا ہو گیا۔

اگلے روز جب وہ کالج میں ملے تو آصف کے چہرے پر حقیقی انبساط کی جھلک تھی اور اس کے قبسم میں شکافتگی تھی۔ ایسی کو دیکھ کر وہ حسب معمول اس کی طرف بڑھا اور باتھا کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تسليم۔“ ایک ہی نظر میں ایسی کو محسوس ہو گیا کہ یہ آصف کل والا آصف نہیں تھا وہ آصف جو تین گھنٹے یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے پتھر کا بننا ہو۔

”زہرتو نہیں کھایا تم نے۔“ ایسی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تم نے جو کہا تھا انتظار کرو۔“

”تو انتظار کر رہے ہو۔“ ایسی نے اسے چھیڑا۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”اب اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ ادھر تھا ای میں گھومیں یہاں لڑکے آ جاتے ہیں۔ اسکیلے میں بتاؤں گا تمہیں۔“ اور وہ دونوں میدان کی طرف نکل

آصف نے بات شروع کی۔ ”اس اڑکی نے مجھے بہت شگ کیا ہے ایلی۔“

آصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو ہی جو اس روز مقابل کے چوبارے میں کھڑی تھی۔ جس روز تم آئے تھے۔ جس نے روشن دان پر اپنی پیٹ پھینکی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایلی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ عام اڑکیوں کی طرح کوٹھے پر چڑھ کر ہمارے کھڑکی طرف جھانٹا کرتی تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ امان کی معرفت شکایت بھی بھجوائی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اماں نے ہنثوں اعلانیہ کوٹھے پر ٹھلانا شروع کر دیا۔ حمارا دان کوٹھے پر دھوپ میں کھڑی رہتی۔

خیر وہ دن بھی گزر گئے پھر گرمیاں ۲۰۰۲ء میں تو ہم کوٹھے پر سونے لگے۔ ان کے کوٹھے پر ہماری طرح پردے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ صبح سوریے وہ اٹھ پڑھتی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے ہمارے کوٹھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ رہتی۔ جب تک میں نہ جا گتا وہ اسی طرح پڑھتی پھر جب میں بیدار ہو جاتا تو وہ منہ سے ہاتھ ہٹاتی اور مجھے سلام کر کے مسکراتی۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے اس نے صبح سوریے مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کی قسم کھار کھی تھی۔ مجھے دیکھنے سے پہلے وہ منہ سے ہاتھ نہ ہٹاتی تاکہ کوئی اور اس کے رو بروند آئے۔ گھروالوں نے اس بات پر اسے مارا پیٹا۔ مگر انپی ہٹ سے بازنہ آئی۔ آخر گھروالے ہار گئے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ محلے والے کیا کہیں گے۔ میں سوچتا رہتا۔ محلے کے لوگوں کو دیکھ کر سر جھکالیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ پر نہ رہے ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ لیکن اب اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ گویا وہ اپنے بس میں نہیں رہی اب اسے ہٹریا کا دورہ پڑتا ہے یا وہ پا گل ہو چکی ہے۔ چند ایک دن سے اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔

منہ سو جا ہوا ہے اور اسے قطعی پروانہیں کوہ کیا کر رہی ہے اسے کسی بڑے چھوٹے کی پروانہیں۔ وہ کوٹھے پر چڑھ کر با آواز بلند میر انام لے لے کر پکارتی ہے۔ آوازیں دیتی ہے۔ آصف آصف جی۔ لوگ سن کر ہستے ہیں۔ میر انداق اڑاتے ہیں۔ پھر وہ مقابل کے چوبارے میں آ جاتی ہے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر با آواز بلند باتیں کرتی ہے۔ اگر میں سما نہ جاؤں تو پھر پھیلتی ہے۔ آصف نے آہ بھری اس کی آنکھیں ڈپڈا گئیں اور وہ خاموش ہو گیا۔ ایلی یہ رو سید اون کرخوشنگی کی ایک لہر محسوس کر رہا تھا۔ کتنا خوش نصیب ہے اف۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جسے بھی کی محبت حاصل ہے جسے دیکھنے کے لئے کوئی مدد پر ما تحد کئے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آصف اس بات پر آبدیدہ گیوں ہو رہا تھا۔ اس بات پر زبردھانے کا مطلب۔

”اور..... اور۔“ آصف نے پھر بات شروع کی۔ ”اس نے اپنا نام بھی بدال لیا ہے۔ اب وہ سفینہ کی بجائے اپنے آپ کو آ صفحہ کہتی ہے۔ آ صفحہ کہتی جرات ہے۔ لیکن اب وہ چلی گئی ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”اس کے والدین زبردستی اسے لے گئے ہیں۔ نہ جانے کہاں۔ تاکہ بدنامی نہ ہو۔ اللہ کرے وہ کبھی واپس نہ آئے۔“

”کیا واقعی اسے تم سے محبت ہے۔“ ایلی نے حسرت ناک انداز سے پوچھا۔ آصف ہنسنے لگا۔ ”مجھے کیا معلوم۔“ وہ بولا کہ محبت کیا ہوتی ہے اگر یہی محبت ہے تو اللہ بچائے تو بکتنی بدنامی ہوئی ہے۔ کتنی رسوانی۔ ”کیا تمہیں بھی اس کا خیال ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ منہم نگاہوں سے ایلی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں تنیر کی مررت تھی۔

”کیا وہ خوبصورت ہے آصف؟“ ایلی نے پوچھا۔

”خوبصورت“ آصف سوچنے لگا اور پھر نہ کر بولا۔ ”یہ بھی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔“

اس روز ایلی آصف کی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ کس قدر عجیب باتیں تھیں آصف کی۔ شریف سے کس قدر مختلف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر محبت کے متعلق ہر ایک کاظمیہ مختلف کیوں تھا اور محبت کی حقیقت کیا تھا۔ وہ تو اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اسے تسلیم ہے محبت ہے اور محلہ والوں کے سامنے اسے تسلیم کرنے میں ذرا نہ چکراتا تھا۔ لیکن آصف۔

دن بھر ایلی بوڑھنگ میں بیٹھے ہوئے سوچتا رہا۔ اس کے سر پر آموں کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا میں جھوٹی رہیں۔ کھیت گویا بال پھیالائے ہوگ مناتے رہے اور دور رہت کر اپنارہا۔ یونہی دوپہر سے شام ہو گئی اور مغرب میں بادل کسی ان جانے غم سے سلکنے لگا۔ آگ کے شعلے لپکنے لگا۔ ایک انحراب۔ دکھبری بے قراری۔ خاموش غم فضا سے چھٹتا رہا۔

بادلوں کے ان گلزوں میں تسلیم اس کی طرف دیکھ کر مسکراہی تھی۔ اس کی لشیں ابھی ہوئی تھیں۔ پھر دفتا ایک حرکت سی ہوئی اور تسلیم نے گول مٹوں صورت اختیار کر لی۔ جیسے گھڑی ہو۔ پھر بزرگ گھڑی کے پٹ کھل گئے اور چشم سے کسی نے جھانکا۔ ”مجھے تم سے ڈر آتا ہے ایلی۔“ ایک متجمسم آواز سنائی دی اور پٹ پھر سے ہند ہو گئے۔ وہ چونک پڑا تو پہ ہے۔ وہ زیر لب بولا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جلد ہی ایک بدلتی نے کرش کہیا کا روپ دھار لیا۔ لٹک لٹک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دو بڑی بڑی سیاہ کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ دو رکوئی بانسری بجارتھا۔ کتنی اداس تھی۔ وہ شام۔ اوس اور خاموش۔

یگلی بہان

اگلے روز تسلیم کے گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اگر تسلیم کو بھی کچھ ہو جائے جیسے آصف کو ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے جتن اٹھا کر سامنے آ کھڑی ہو جیسے اس روز آصف کھڑی تھی اور پھر اسی طرح کہے ”تم سامنے کیوں نہیں آتے؟“ تو کیا زندگی بن

جائے۔ یا جب وہ وہاں پہنچے تو تسلیم آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوا اور اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر مسکرائے۔ ”سلام“ اور پھر نہ کر اندر بجاگ جائے۔ صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار۔ روز نہ کسی صرف ایک بار۔ صرف ایک بار صرف ایک بار کا اور دوسرتا ہوا وہ ان کے گھر پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر فعتا اسے خیال ہوا کہ وہ منزل پر پہنچ چکا ہے۔ مگر منزل ویران پڑی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ سینٹر چیل خالی تھیں۔ دریتک وہ وہاں کھڑا مایوس و مخروم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا جی چاپا کہ چکے سے لوٹ آئے اور نہر والی کوٹھی میں آموں کے ورختوں تلتے بیٹھ کر بھر کر روانے۔ روٹا رہے حتیٰ کہ اس کے نام کے بند بند میں وہ چلنا تھا ہوا درخت مہم ہو جائے جو ان دونوں وہ محسوس کرنے لگا تھا۔

”ہائیں تم ہو ایلی۔“ حتیٰ اسے دیکھ کر چلا گیا۔ یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ جیسے پٹ کے آئے ہو۔ آؤ۔ آؤ۔ تمہارا اول بہلاوں۔ اس کے پاس جا کر سب دکھول جاتے ہیں۔ نہیں نہیں گھبراو نہیں۔ اس کے یہاں کوئی نہیں آتا جاتا۔ اس نے دھنہ چھوڑ رکھا ہے۔ کیسے کرے دھنہ۔ ہمارے عشق میں مری جا رہی ہے اور ایلی ایمان سے وہ توازی طور پر گھریلو عورت ہے خالص پہمنی۔ اس کے پاس بیٹھ کر ایسے محسوس کرتا ہوں۔ جیسے ماں کی گود میں بیٹھا ہوں اتنا آرام و سکون ملتا ہے وہاں، آؤ۔ آؤ۔ لے چلوں تمہیں۔“

”آہا ایلی۔“ آغا بال بناتا ہوا باہر نکلا۔ ”بھائی اب تو آتے ہی نہیں تم اس طرف۔ کون سے نئے مشاغل پیدا کر لئے ہیں اور وہاں.....“

”کیوں ایلی چلو گے؟“، ”جی نے آغا کی بات کو کاٹ کر کھا۔“

”نہ۔ نہ بھائی۔“ آغا نے جی سے کہا۔ ”اس پر تو کرم ہی کر۔“ اس پر جی منہ بننا کر چل پڑا اور ایلی آغا کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ جی اسے وہاں لے جائے جہاں ماں کی آغوش کا ساسکون میسر ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہو جو محبت کے

لئے دھنده چھوڑنے کی جرأت رکھتی ہے۔ جو روپوں کی جھنگار کو محبت پر قربان کر سکتی ہے۔

”کس سوچ میں کھوئے ہوئے آج؟“ آغاز ہوا۔ ”بہت اداس ہو۔“

جواب میں ایلی نہس دیا۔ ”نہیں تو اداس تو نہیں۔“ اس نے آہ پھر کر کھا۔

”تو کوئی بات شناو۔“ آفانے کھا۔

”کوئی بات ہو بھی۔“

”اوہ۔“ اس نے سکردا دیا اور پھر وانت صاف کرنے لگا۔

ایلی نے چوری چوری اوپر کی طرف نظر روزانی گروہاں کوئی پیو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ نہ جانے اس قدر خاموشی یہوں چھائی ہوئی تھی۔

”جھی کی بات سنی تم نے؟“ آفانے بات شروع کی ”حد ہو گئی اس کا نام الماس ہے۔ نئی نئی آئی ہے۔ یہاں اچھی خاصی ہے۔ نوجوان ہے۔ نہ جانے جھی نے کیا کر دیا ہے۔ بیچاری نے دھنده چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے جواری میراثی بھوکے مر رہے ہیں اور جھی کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے ڈرے۔ تو بے کرو۔ ڈر تو اس کی گھٹی ہی میں نہیں۔ سارا دن وہاں جا کر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اس کی جرایں دھوتی ہے پتلوں میں استری کرتی ہے۔ چائے بنابنا کر پلاتی ہے۔ عجیب جذبہ ہے محبت کا۔“ آفانہ نہیں لگا۔ دھنده کرنے والیوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ کوئی معصوم نہیں ہے وہ اناثی نہیں۔ سب کچھ بھتی ہے۔ جانتی ہے کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ جھی محض وقت کی کڑی رہا ہے۔ پھر بھی وہ فریب کھائے جاتی ہے۔ عجیب بات ہے۔ ”آفانہ نہیں لگا۔“ آج تمہیں سیر کر لائیں، آؤ۔“

جب وہ چلنے لگے تو دفتا اور سے نیم کی آواز آئی۔ ”بھائی جان میں آ رہی ہوں۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“ آفانے نہس کر کھا۔

”میں آ جو رہی ہوں۔“ وہ سیرھیاں اترتے ہوئے بولی۔

”خواہ تجوہ۔ مجھ سے کام ہے کیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

”تو پھر میں کیا کروں۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ مٹنے لگی۔

”تو پھر چلا کیوں رہی تھی تو۔“

”بس چلا رہی تھی۔ یونہ۔“

”اچھا شور نہ مچا ہم جائز ہے تیں۔ آ والی۔“

آ غلابت کر رہا تھا تو چھوٹی نیم اسی کی پشت کے پیچھے سے یوں ہونٹ ہلا رہی تھی جیسے کچھ کہہ رہی ہو جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو۔ لیکن ایسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب آ فاصلنے لگا تو وہ پھر چلائی۔ ”کہتی ہوں کوئی پر بلا رہے ہیں آپ کو۔“

”بلا رہے ہیں کیوں۔“

”کیا معلوم۔“ وہ پھر ہونٹ ہلا کر ایسی کو اشارہ کرنے لگی۔

”اس وقت نہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔“ آ فانے گھوکر کہا۔

”اچھا تو اچھے بھائی جان میں ایک پان لے دو۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ آ فانے لگا۔ ”خود لے لینا یا لو پیسے۔“

”ہم تو پان لیں گے پیسے نہیں۔“ وہ لاڑ سے بولی۔

”پاگل ہو گئی ہے کیا۔“ آ فانہسا۔

”ہاں۔“ نیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پاگل ہو گئی ہوں۔“

آ غا قہقہہ مار کر نہس پڑا۔ ”یہ یہ نہیں بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ اچھا میں لاتا ہوں پان۔ تو اب بھاگ نہ جائیو۔“

”نہیں بھاگتی۔“ وہ مسکرائی۔

آ غالبا ہر لگاتو وہ ایلی کے قریب تر ہو کر بولی۔ ”اپنا بامیکسل نہ لے جانا میں چھوڑ جانا اور کل شام کو تین بجے آ کر کہنا بامیکسل دو۔“ اس نے ایلی کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو۔ اس روز پہلے دن ایلی نے محسوس کیا کہ وہ شخصی مخصوص بچی ایک مکمل عورت تھی جس کے پاؤں میں کئی آغوش مادر جیسی ہوئی تھیں۔ یہ کہہ کروہ اوپر کی طرف بھاگی۔

”ہائی۔“ ایلی چلایا۔ ”اور وہ پان۔“
”پان۔“ وہ بخی۔ میں کھاتی پان والی نہ بخی۔“
عین اس وقت آنا والی خواہ ہوا۔ ”ایں پھلی گئی اور یہ پان۔“ اس نے پھر قہقهہ لگایا۔ ”ہی ہی۔ یہ کہیں بالکل ہی پکی ہوئی ہیں۔“ اور وہ پان منہ میں ڈال کر ہٹنے لگا۔

”سائکل لے لو چلیں۔“ آف نے ایلی سے کہا۔

”نہیں۔“ ایلی نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں ہی پڑا رہے گا کل لے لوں گا کسی وقت۔۔۔“ ”اچھا یوں ہی ہی۔“ آف نے بے پرواہی سے کہا اور وہ دونوں چل پڑے۔

اتنی ساری

اس روز جب ایلی بورڈنگ پہنچا تو وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کئی ایک دنوں سے ایک بے نام سادرو اس کے بند بند میں چیزوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے اس کا وجود ایک تکلیف دہ چیز ہو۔ اس کے گرد نیلا آسمان روز بروز پھیکا پڑتا جاتا تھا اور دنیا یوں دکھائی دینے لگی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ طویل و عریض ویرانہ۔ بے مقصد پھیلاو۔ ایک افیمت دہ ٹھہراو چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس صحرائیں وہ خود ایک ناؤ تھا۔ جس کے گرد ریت کی لہریں بھتنوں کی طرح ناج رہی تھیں۔

جب بھی ایلی کی توجہ اپنی جانب مبذول ہوتی تو وہ اس ٹھہراؤ کو شدت سے
محوس کرتا لیکن جب اس کی توجہ ریت کی لہروں کی طرف منعطف ہوتی تو اسے
حرکت کا احساس ہوتا۔ جب وہ بستر پر لیٹا تو اس کا خیال نیم کے پیغام پر مرکوز ہو
گیا۔ نہ جانے نیم کا مطلب کیا تھا۔ مطلب تھا بھی یا شخص تفریح یا کچھ اور پھر با یکسل
رکھنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے اور اسے واپس لانے کی حکیم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا
ہے۔ دری تک وہ اس پلیٹ کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ لیکن کتنی نہ کھلی۔ وہ سوچ سوچ
کر ہار گیا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

انگے روز کوی واقعہ نہ خیال آیا کہ سائیکل وقت مقررہ پر لانے کی آخر کیا
ضرورت ہے۔ کسی وقت بھی لے آؤں گا کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں
امید کی ایک کرن روشن ہو جاتی۔ شاید فرق پڑ جائے پھر جلد ہی وہ کرن بجھ جاتی اور
گھٹاٹوپ پاندھیرا چھا جاتا۔ لیکن اس کٹکٹش کے باوجود وہ مقررہ وقت پر آفاصاحب
کے گھر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوبارے کی کھڑکیوں پر نگاہ دوڑائی۔ بیڑھیوں
کی طرف دیکھا مکان گویا ویران پڑا تھا۔ بے ولی سے اس نے دروازہ کٹکٹھا لیا۔

”کون ہے؟“ بڑھیا نے آواز دی۔

”میں ہوں ایلی۔“ وہ چلا یا۔

”کوئی گھر نہیں ہے نہ آفے ہے نہ جی۔“ بڑھیا نے رونے کے انداز میں کہا۔

”اپنا سائیکل لینے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”سائیکل؟“ بڑھیا خاموش ہو گئی۔ پھر مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ ”سائیکل
ساتھ والے گھر میں کھڑا ہے۔ یہ جو ادھر ہے۔ پنواؤی کے پیچھے والا سمجھ گیا نا۔ لے
لے جا کر ادھر سے۔“

یہ انتہا تھی۔ اتنی بے رثی تو اجنبی کے ساتھ بھی نہیں بر تی جاتی۔ خیر بڑھیا کی
عادت ہی ایسی تھی۔ لیکن وہ نیم کیا ہوئی۔ کم از کم اسے تو موجودہ هناچا ہئے تھا، کچھ دری

تو وہ ڈیوڑھی میں کھڑا سوچتا رہا۔ اس امید پر کہ شاید ابھی دروازہ کھل جائے اور نیم
جھانکے۔ لیکن دروازہ بند ہی رہا۔ پھر وہ مایوس ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اب کون پتہ
لگائے کہ وہ مکان کونسا ہے۔ جس میں بائیکسل پڑا ہے۔ چھوڑو بائیکسل لیکن اس نے
محسوں کیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اتنی دور آجھوں کی کوئی تک واپس پیدل جانا۔ اس
خیال پر وہ پنواڑی کی بوجان پر جا کھڑا ہوا۔ ”کیوں صاحب۔“ وہ بولا۔ ”آپ کے
پچھلے مکان کی طرف کو نہ سارستہ جاتا ہے۔“

”یہ ہے۔“ پنواڑی نے قریب تھی ایک ڈیوڑھی کی طرف شمارہ کیا۔

”انہوں نے کہا ہے۔“ میرا بائیکسل وہاں رکھا ہے۔ اس مکان میں کون رہتا
ہے؟“ اس نے پنواڑی سے ملتباخ انداز سے پوچھا۔ پنواڑی نے غور سے ایلی کی
طرف دیکھا پھر بولا۔ ”کوئی نہیں رہتا خالی پڑا ہے۔“

جم جکتے ہوئے اس نے ڈیوڑھی سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی دکھائی نہ دیا۔ آواز
تک بھی نہ آ رہی تھی۔ پھر جرات کر کے وہ اندر داخل ہو گیا۔ صحن کے عین درمیان
میں سائیکل کھڑا تھا اور مکان ویران پڑا تھا۔

مکان کے درمیان ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے ارڈگر دچاروں طرف والاں بنے
ہوئے تھے۔ جن میں بہت سے دروازے اور فرائخ کھڑکیاں تھیں۔ وہ چپ چاپ
سر جھکائے سائیکل کی طرف بڑھا اور اسے شینڈے سے اتارنے لگا۔ جب وہ اسے
گھٹیئے لگا تو دفتار چاروں طرف والاں سے کئی ایک جوان لڑکیاں جھانکنے لگیں۔ وہ
سب نہ رہی تھی۔ مسکرا رہی تھیں۔ پھر وہ سب والاں سے نکل کر باہر صحن میں آ
گئیں اور آن کی آن میں اس صحن میں رُلیں آنچل لہرانے لگے۔

بیچارہ

”لے جاؤ بائیکسل،“ ایک پتلی لمبی لڑکی آگے بڑھ کر بولی۔

”کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“ دوسری نے کوہبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈانگا اور پھر

”یہ ہے کون؟“ ایک اور چمک کر بولی۔

”پوچھو تیم سے۔“ عقب سے ایک شوخ آواز آئی اور وہ کھلکھلا کر بھی۔

چاروں طرف سے ان لڑکیوں نے گویا ایلی پر اورش کر دی۔ خوبصورت ایک ریلا آیا کئی ایک اڑتے ہوئے آنچل۔ اس کی طرف لپکے جیسے کالے ناگ زبانیں نکالے جھپٹ رہے ہوں۔ زن سے بالی کا سر جسم سے الگ ہو کر فضا میں اڑا جیسے بارود کا بنا ہوا ہو۔ نگین خوبصوردار آنچل شعلوں کی طرح اسے چاٹنے لگے۔ اس کے اوسان خطاب ہو گئے۔ آنکھوں تک دھنڈ چھا گئی۔ گورے پھٹمنس چہرے۔ سیاہ ڈوتی آنکھیں لہراتی ہوئی چوٹیاں اس سے مل کر گئیں۔ پھر دھنڈا تیم تیم کا شور بلند ہوا اور وہ سب بھاگیں اور ایک مقام پر یوں گدھدھ ہو گئیں۔ جیسے جمناسک گروپ دھنڈا ایک نئی ترتیب میں تشكیل ہو جاتا ہے۔ ”تیم تیم“ وہ کسی پر جھکی ہوئی چلا رہی تھیں۔ پھر وہ کسی کو گھستی ہوئی ایلی کی طرف بڑھیں اور ایلی نگین آنچلوں، گوری گوری بانہوں، ریشمی چوڑیوں اڑتی ہوئی خوبصوردار لشوں اور لشوں اور لشوں اور لشوں کے انبار میں دب گیا۔

”پکڑو۔ پکڑو اسے۔“ وہ ایلی کو للاکار رہی تھیں۔ ”سنjalawapni پیاری کواب پکڑ بھی لو نا۔“ کئی ایک گوری بانہیں اس کی طرف لپکیں اور بالآخر دو بازوں کے پاٹھوں میں تھما دیئے گئے۔ ایک قہقہہ گونجا اور پھر وہ سب ہنستی ہوئی اس زینے کی طرف بھاگیں جو صحن کے ایک کونے سے کوٹھے کی طرف چلا گیا تھا۔ زینے پر نگین آنچل اپر اے قہقہوں کی آوازیں گونجیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے دیکھا کہ وہ سفید سفید بازو تھا مئے تن تھا کھڑا ہے اور فرش پر نگین کپڑوں کی ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سفید بازوؤں کو کیا کرے اور اس گٹھڑی کو کس طرح کھولے ”تیم تیم“ اس نے بازوؤں کو چھنجھوڑا۔ ”تیم ادھر دیکھو۔“ اس نے گٹھڑی کو کھولنے کی کوشش کی مگر گٹھڑی اور بھی سمٹ گئی۔ وہ اس بند گٹھڑی سے گویا

کشتنی اڑنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ گھڑی کے پلو اور بھی لپٹ گئے۔ حتیٰ کہ وہ بازو بھی کہیں گم ہو گیا اور وہ گھڑی اس کے قدموں میں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا بن کر رہ گئی۔ ”تیم تیم“ وہ چلایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ”تیم.....“ اوپر سے بڑھیا کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ روپ کروہ گیند اس کے ہاتھوں نے پھسل کر نکل گئی۔ ایک ساعت کے لئے زینے میں نکلیں پولہر لایا پھر کوٹھے سے ایک سرخ چہرے نے اس کی طرف مرڑ کی دیکھا۔ جیسے وہ بانیات کا بنا ہوا ہو پھر اس مکان پر موت کا سکوت پھاگیا۔ والانوں کے خاموش کونے کو یا باہر نکل آئے اور اس پر ہٹنے لگے۔ اس کا تخت خراڑا نہ گئے۔ ”تم تیم“ اور کوٹھے کے پروے جھک جھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ”بیچارہ۔“

وغذا اس نے محسوس کیا کہ اس کا راز کھل چکا ہے۔ وہ سب جان گئی ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ایک گھڑی تک نہیں کھول سکتا۔ دو بازوؤں کو نہیں سنبھال سکتا۔ بیچارہ اس نے محسوس کیا کہ وہ سب والانوں کی دیواروں کے پیچھے کھڑی اس پر نہیں رہی ہیں اور اوپر کوٹھے پر تیم مالیوں و محروم کھڑی ہے۔ اور اس کا چہرہ جذبہ تھیں سے سرخ ہو رہا ہے۔ صحن میں پڑا ہوا سائیکل سرک کر پرے ہٹ ہٹ گیا۔ جیسے وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو۔ ایلی کی پیشانی پر پیشہ آ گیا اور وہ سائیکل اٹھا کر بھاگا۔ بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے رہ کر اسے اپنی بزدلی اور حماقت کا احساس ہوتا اور محسوس کرتا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اتنا اچھا موقعہ ملنے کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہاں اتنی لڑکیاں تھیں۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا حتیٰ کہ وہ تیم کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں اس واقعے کی یاد کا نیابن کر چھینے لگی اس طرح وہ واقعہ اس کے لئے ایک تلخ اور خوشنگوار واقعہ بن گیا۔ ”بیچارہ۔ بیچارہ۔“ سائیکل کافری ویل چلا رہا تھا اور سڑک پر وہندی اشکال اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

اس واقعہ کے بعد مدت تک ایلی کو آغا کے گھر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب بھی آغا کے مکان کے متعلق اسے خیال آتا تو وہ محسوس کرتا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، اس کوچے کی تمام نوجوان لڑکیاں چوباروں میں کھڑی اس پر نہیں رہی ہیں۔ اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہیں۔ ”ونہی ہے وہی“، اس خیال کے آتے ہی اسے پینہ آ جاتا۔

حکایتی

پھر اتفاق سے کالج میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی، جس نے ایلی کی توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ تحریک ایک درامہ کھیلنے کی تحریک تھی۔ مگر اس تحریک کی ابتداء نوکھی تھی اور اس کی تمام ترقیہ داری اللہ والو پر عائد ہوتی ہے۔

اللہ والو قدری طور پر ایک مسخرہ و ایقون ہوا تھا اور اس کا نام اتفاق اس قدر سمجھی گی کا پہلو لئے ہوتا کہ انسان کو بے اختیار ہنسی آ جاتی مثال کے طور پر کالج میں اس کا داخلہ بھی انوکھے انداز سے ہوا تھا۔ ایک روز چادر باندھے ایک تھیلا اسی قمیص پہنے اور شانے پر ایک بڑا سارو مال ڈالے وہ کالج کی کمپاؤنڈ میں کھڑا ہستہ سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے پرنسپل اس طرف سے گزر اپرنسپل اسے کھڑا دیکھ کر سمجھا کہ کوئی جاث کالج کی حدود میں آ گھسا ہے۔ پرنسپل اس کے قریب آ کر کھڑا ہوا۔ اس پر وہ جھجک محسوس کئے بغیر وہیں کھڑا رہا۔

”اے چودھری۔“ پرنسپل نے کہا ”یہاں کیا کر رہا ہے تو؟“

”میں۔“ وہ چونکا۔ ”دیکھا نہیں کہ کھڑا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر لڑکوں کو دیکھنے لگا جو کمپاؤنڈ میں کر کٹ کھیل رہے تھے۔

”کسی سے ملے گا کیا؟“ پرنسپل نے اپوچھا۔

”اوہوں بھی۔ دیکھ رہے ہیں۔ کر کٹ کا کھیل۔“

کر کٹ کا لفظ سن کر پرنسپل چونکا۔ ”پڑھے لکھے ہو کیا؟“

”اور تو کیا ویسے ہی کھڑے ہیں۔“ وہ بولا۔

”یہاں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔“ پر پل بولا۔ ”یہ کافی گراونڈ ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”اجازت نہیں تو چلے جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کروہ پھلانگ کر کافی

کی چار دیواری پر چڑھ لیا اور دیوار پر بیٹھ کر رکھ دیکھنے لگا۔

اس پر پر پل کو بے حد طیش آیا اور اس نے قریب جا کر کہا۔ ”اب دیوار پر بیٹھ گئے۔“

”تم نے جو کہا تھا کہ گراونڈ میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔ اب کیا یہاں بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں۔“ وہ تنک کر بولا۔

پر پل کو اس کی وہ قانیت پر بنسی آگئی۔ بولا۔ ”تم اس کھیل کو سمجھتے ہو کیا۔“

”سمجھتے۔“ اس نے پر پل کی طرف دیکھا۔ ”ہم نے تو اس کھیل کو کھیل کھیل کر چھوڑ دیا ہے۔ اب کسی زمانے میں کھیلا کرتے تھے۔“

”کہاں کھیلا کرتے تھے؟“ پر پل نے پوچھا۔

”مدرسے میں اور کہاں۔“

”اچھا تو مدرسے میں پڑھتے رہے ہو۔“

”ہاں،“ وہ بولا۔ ”وہ پاس کی ہیں۔“

”اور اب کیا کرتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں۔“

”کر کٹ کھیلو گے آ تو تمہیں کھلائیں گے۔“

اللہ واں نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ”واہ کھڑا ہونے تو دیتے نہیں اور کہتے ہو کہ کر کٹ کھلائیں گے۔“

پر پل قہقہہ لگا کر ہٹنے لگا اور پھر اسے پکڑ کر ٹیم میں لے گیا۔ ”لو بھی ایک نیا پل بیٹھ لائے ہیں ہم۔“ وہ بولا۔ اللہ واں نے گینداٹھا لیا اور باعثیں ہاتھ سے بال کرنا شروع

کر دیا اور ایک ہی اور میں اس نے کالج کے دو بہترین ٹھلاڑیوں کی وکٹیں اڑا دیں تو پرنسپل نے واہوا کا شور مچا دیا پھر پرنسپل اسے اپنی لینڈو میں بٹھا کر گھر لے گیا اور اگلے ہی روز اسے کالج میں داخل کر لیا گیا۔ اس کی تمام فیسیں معاف کر دی گئیں بلکہ پور (Poor) فنڈ میں نے اس کے لئے ستائیں خریدی گئیں اور ایک جوڑا کپڑوں کا بنا کر دیا گیا تاکہ وہ مناسب کپڑے پہن گر کالج آئے۔

مخترا

ایک روز اللہ داد بر آمدی کے کونے پر کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ گیارہویں کا کوئی چھوٹا سا لڑکا بھاگتا ہوا ادھر آنکھا اور اللہ داد سے ٹکرنا کر گر پڑا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے اٹھایا۔ ”شہیتا، وہ بزرگانِ نہاد میں یولا۔“ اندھا وضنڈ بھاگا نہیں کرتے۔ ”اللہ داد نے اس کے پرے جھائڑے اور پھر اس کا منہ چوم کر کھا۔“ ”جے برخودار ایسے نہیں کیا کرتے۔“ اس پر اردو گرد کھڑے سب لوگوں نے تالیاں پیٹ دیں اور بہت ہنگامہ برپا کیا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے اس لڑکے نے جا کر پرنسپل سے روپورٹ کر دی۔ اس روپورٹ پر پرنسپل غصے میں آ گیا اور اس نے اللہ داد کو فوراً افتر میں طلب کیا۔ ”اللہ داد تمہارے خلاف شکایت پہنچی ہے ہمیں۔“ انہوں نے غصے میں کہا۔ ”جی کیسی شکایت۔“ ”اللہ داد نے معصومیت سے پوچھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ تم نے گوبندا کا منہ چوما ہے؟“ وہ طیش میں بولے۔ ”جی ہاں۔“ ”اللہ داد نے سر جھکا کا لیا۔

”ہوں۔“ پرنسپل غریا۔ ”تو تمہیں اس کی سزا مانی چاہیے۔“ ”غلطی ہو گئی مجھ سے جناب۔“ ”اللہ داد یولا۔“

ممکن ہے اللہ داد کا یہ قصور بھی معاف کر دیا جاتا اور اسے آئندہ کے لئے سرزنش کر دی جاتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا ہی ہو گا کیونکہ ہر بات میں پرنسپل اللہ داد کی رحمائیت کیا کرتے تھے۔ بلکہ ایک روز اللہ داد کی شرارت پر تو پرنسپل صاحب نے

اعلامیہ قہقہہ مار کر کہہ دیا تھا۔ ”اللہ داد کو معاف نہ کروں تو اور کیا کروں اگر جرمانہ کر دوں تو وہ جرمانہ بھی کانج کے کسی فنڈ سے ہی ادا کرنا پڑے گا۔ بھی اس کے پاس کچھ ہو بھی۔“ پرپل کی یہ بات سچی تھی۔ اللہ داد کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔

لیکن اس روز پرپل بے حد غصے میں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی اس بد تمیزی پر اسے پانچ روپے جرمانہ کر دیا۔ اللہ داد نے تو جرمانہ ادا نہ کیا۔ بہر حال دفتر نے جرمانے کی ادائیگی کے لئے تقاضا جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اللہ داد کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ جرمانا ادا کرنا ہی ہو گا۔

ایک روز وہ شفعت سے کہنے لگا۔ ”یا شفعت اب تو اس جرمانے کا کچھ کرنا ہی ہو گا۔“

”کرنا کیا ہے؟“ شفعت بولتا۔ ”پانچ روپے دیے دو اور گیا۔“

”اچھا بھی۔“ اللہ داد نے کہا۔ ”تو مجھے دس روپے قرض کے طور پر دے دے یا۔“

”ہاں یا روس ہی دے دو۔“ اس نے کہا۔ ”یا تو یہ زائد پانچ اصل کو بھی واپس لے آئے اور نہیں تو دوں ہی گئے۔ یہ جو اکھیل ہی دیکھوں۔“

اگلے روز اکاؤنٹنٹ نے پرپل سے جا کر شکایت کی کہ اللہ داد پانچ کی بجائے دس روپے جرمانہ ادا کرنے پر مصروف ہے یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔

اللہ داد کو طلب کیا گیا۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟“ پرپل نے پوچھا۔ ”جرمانے تو تمہیں پانچ روپے ہوا ہے اور تم دس ادا کر رہے ہو یہ کیا حماقت ہے۔“

اللہ داد نے سر جھکا لیا۔ ”نہیں حماقت نہیں جی۔“ وہ بولا۔ ”تو پھر کیا ہے؟“ پرپل نے پوچھا۔

”صاحب پانچ روپے تو جرمانہ دیا ہے اور پانچ روپے جمع کراویے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ پرپل نے پوچھا۔

”جی کسی وقت پانچ روپے ہوتے ہیں۔ کسی وقت نہیں ہوتے اور ان

برخورداروں کا کیا اعتبار نہ جانے کب آ کر الجھ جائیں۔“

اللہ دادنے یہ بات کچھ ایسی سنجیدگی اور معصومیت سے کہی کہ پہل قہقہہ مار کر نہ پڑے۔ ”تو مطلب یہ ہے کہ پانچ ایڈ و انس کے طور دے رہے ہو۔ ہاہا۔“ وہ نہے۔ ”حد ہو گئی۔ اللہ داد تمہیں تو تحریر کا سخرا ہونا چاہیے خواہ مخواہ کالج میں پڑھ کر وقت گنوار ہے ہوتم۔ ہی ہی ہی۔“

”حضور میر اکیا ہے۔ آپ نے کالج میں داخل کر لیا تو کالج میں داخل ہو گیا۔ تحریر میں داخل کرو یہ تو تحریر میں داخل ہو جاتا۔ میر اکیا ہے۔“
”اچھا تو تمہیں تحریر میں داخل کر دیں گے، پہل ہستا ہوا چلا آگیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو اللہ داد کا جزو نہ معاف نہ دیا گیا اور دوسرے کالج کی مجلس تمثیل کا اجرہ ہو گیا۔ اور چند ہی دنوں میں کالج میں شکنستلا کے کھیل کی ریہرسل شروع ہو گئی۔

شبہ لگن

ایلی کو موسیقی سے بے حد لچکی تھی۔ گانے کی آواز سن کر اس کے دل میں چو ہے سے دوڑنے لگتے۔ دل بیٹھ جاتا ایک رنگیں ادا سی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ جب سے شکنستلا کی ریہرسل شروع ہوئی تھی، اس کے لئے بورڈنگ میں جانا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ عام اڑکوں کو ریہرسل دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور ریہرسل کے وقت ہال میں ان اڑکوں کا داخلہ منوع تھا، جن کو ڈرامہ کھیلنے کے لئے نہیں چنا گیا تھا۔ اس لئے جب ریہرسل شروع ہوتی تو وہ ہال سے باہر دروازے کے شیشے سے لگ کر دیکھتا اور جب سازندے حمد کی دھن بجاتے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ چند ہی یوم میں ایلی کو تین چار مرتبہ ریہرسل سنتے پکڑ لیا گیا اور آخر کار اڑ رامے کا انچارج اسے پہل کے پاس لے گیا۔ پہل نے پہلے تو اسے ڈامناؤ پٹا۔ پھر دفعتہ نہ جانے اسے کیا سو جھی بولا۔ ”ہوں اگر تمہیں ڈرامے سے لچکی

ہے تو عملی طور پر ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔“

”عملی مدد۔“ ایلی سوچنے لگا۔

”تم گا سکتے ہو؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”بھی نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ناچ سکتے ہو؟“

”بھی نہیں۔“

”یہ اچھی دلچسپی ہے۔ وہ بننے لگا۔“ گانجیں سکتے۔ ناچ نہیں سکتے مگر ڈرامے سے دلچسپی ہے۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو پر وی فیر انچارج کے حوالے کر دیا گیا کہ جو مناسب کام کر سکتا ہو، اس سے لیا جائے اور ایلی کو ریہرسل کے دوران ہال میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

جب ”حمد“ کی مشق شروع ہوتی اور میراثی طبلے پر ہاتھ چلاتا تو ایلی کا دل ڈوب جاتا اور اس کے جسم پر بیہر بہوٹیاں رینگنے لگتیں۔ خاص طور پر جب ربانیوں کا وہ چھوٹا سا لڑکا نورا پنی بیٹھی بیٹھی سی آواز میں ”تو جگ کا ہے۔“ کہتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا وہ سب کچھ بھول جاتا۔ تمام تلخ یادیں محو ہو جاتیں یہاں تک کہ وہ بائیکسفل والا واقعہ بھی بھول جاتا جب وہ کپڑوں کی گٹھڑی کے بل کھولنے سے قاصر رہا تھا۔ اس وقت اسے شہزاد کا چشم سے آنا بھی بھول جاتا۔

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ موییقی اسے تلخ یادوں سے آزاد کر سکتی ہے۔ خصوصاً جب نور کیسی شبکن سے بھار آئی گاتا تو ایلی یہ بھی بھول جاتا کہ وہ ایلی ہے کہ وہ علی احمد کا بیٹا ہے اور علی احمد کوٹیں کا سپاہی بننے سے دلچسپی ہے اسے سمجھی کچھ بھول جاتا اور وہ حیرانی سے اس سانورے سے چھوٹے سے نور کی طرف گلکھلی باندھ کر دیکھتا۔ دیکھے چلا جاتا۔ اس وقت نور کے چہرے کے گرد ایک ہلا سانamu دار ہوتا

آنکھوں میں چمک لہراتی۔ بازو رقص کرنے لگتے۔ اس وقت اس کی آنکھیں باتیں کرتیں اس کے چوتون اظہار سے چھلکتے۔ ان کا پیغام کس قدر حسین ہوتا۔

نور کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ایلی کوز نہت کی عظمت کا احساس ہوا۔ اس کا گیت سن کر اس نے محسوس کیا جیسے واقعی بہار آگئی ہو اور وہ شجھنگن جس کی وجہ سے بہار آئی تھی۔
نور بذاتِ خود ہو۔

اس کے بعد ایلی کئی ایک دن شجھنگن اور بہار میں گھویا رہا۔ انتظار کرتے کرتے وہ تمہک جاتا۔ لیکن کالج کا وقت ختم ہونے میں نہ آتا۔ خدا خدا کر کے ریہر سل کا وقت ہوتا اور نور تمہک ملتا ہوا بال میں داخل ہوتا اور ایلی کے لئے بہار آتی۔

معصوم فاحشہ

لیکن چند ہی دن کے بعد ایلی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس پتلے دبلے سانورے اڑ کے میں دو شخصیتیں کام کر رہی ہیں۔ دو مختلف مقضاو شخصیتیں۔ ایک وہ نور جو گاتے وقت اس میں بیدار ہوتا۔ وہ نور جس کی حرکات میں حسن کی جھلک دکھائی دیتی۔ جس کے گلے میں سے گویا پچھلی ہوئی چاندی کا ایک فوارہ چھوٹتا۔ لیکن جو نبی وہ گناہ ختم کر دیتا تو اس کی آنکھوں میں عربیانی بھرا پیغام جھلکتا اور اس کی حرکات سے سنتے پن کا مظاہرہ ہوتا۔

نور کی چال تو بالکل ان عورتوں کی طرح تھی۔ جو کثروار نگین میں دوسرے درجے کے چوباروں میں پیٹھتی تھیں۔ نور کی ان باتوں کو دیکھ کر ایلی کو دکھسا محسوس ہوتا اور وہ جلد ہی کسی اور بات کی طرف توجہ منعطف کر لیتا تاکہ خیال بٹ جائے۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں کافی سا چھمارہ تھا۔ پھر وہ شدید کوشش سے تصور کے زور پر اس نور کو گانے والے نور میں بدل دیتا اور یوں وہ عربیاں منظر شجھنگن میں تبدیل ہو جاتا اور بہار آ جاتی۔

جب آصف کو ایلی کی اس نئی دلچسپی کا علم ہوا تو وہ بہت ہنسا کہنے لگا۔ ”اچھا بھی

آج دیکھیں گے تمہارا نور۔“ اس شام کو آ صفحہ گال ہتھیلی پر رکھے بیٹھا نور کا گانستہ رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی مچھلیوں میں بدل گئیں اس کے ہونٹوں کی وہ تمثیر آمیز سلوٹ وور ہو گئی اور پاؤں انجانے میں تال دینے لگے۔

اس کے بعد آ صفحہ اور ایمان فارغ وقت میں نور کو لے کر آموں والی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے چلے جاتے۔ ایمان کسی پیڑ تسلی میں نہجا تا۔ آ صفحہ مدنی میں پاؤں لٹکایتا اور نور گاتا اور اس شہلکن میں ایمان کی نگاہوں تسلی گفتگر یا میل لٹاہراتی اور آ صفحہ کی آنکھیں جھیلیوں میں تیرتیں اور سوکھے ہوئے ورنچتوں پر ہریاول یورش کرتی اور مدنی کا پانی ناچتا اور آسمان پر پرندے رقص کرتے۔
گانے کے اختتام پر نور کی آنکھیں وہ نورانی چمک بجھ جاتی اور ایک رندی کپڑے اتنا نگلی ہو کر ان کے رو برو آنکھی ہوتی اور نمائش کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ہونٹ جونکوں کی طرح ان کی طرف بڑھتے اور وہ دونوں گھبرا کر وہاں سے چل دیتے اور سوچتے کہ کس طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑائیں۔ اس وقت انہیں یہ فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کوئی انہیں نور کے ساتھ دیکھنے پائے۔ لیکن جو نہیں وہ نور سے جدا ہوتے تو وہ اس کے خیال میں کھوجاتے۔ شہلکن پھر کب آئے گا۔

اتفاق سے ایک روز شیخ ہدم بھی آگئے اور ان عینوں نے مل کر شہلکن منانی لیکن شیخ ہدم خاموش ہو گئے اور پھر مخصوص انداز میں کہنے لگے۔ ”یہ سب ٹھیک ہے۔ الیاس صاحب! لیکن امرتر کے ربا یہ لڑکے سے نہر کے کنارے پر گانستہ اور پھر ماشاء اللہ گانے والے جناب نور صاحب ہوں بات ذرا خطرناک ہے۔“

”خطرناک ہے۔“ ایمان کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات خطرناک کیوں تھی۔ اس میں خطرے کی کیا بات تھی۔ نوران کے ساتھ بے حد انوس ہو چکا تھا اور اب تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ ان کا مقصد موسيقی کے سوا کچھ نہیں اور اس کا پاؤں ٹھکانا، آنکھیں مٹکانا اور ہونٹ نکالنا قطعی طور پر بے کار تھا۔ ایمان نے اب سے پہلے کبھی اتنے

چھوٹے پچے کو ایسی عریاں حرکات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

نور چند ایک روز کے لئے تو ان کا منہ سکتا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا یہ نیا تعلق اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تعلق ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سمجھ میں آتی تو بھی اسے یقین نہیں پڑتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا ایک روز وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں یہ زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ امید بھری نگاہوں سے ایلی اور آصف کی طرف لاکھ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر سوکھے ہوئے درخت جوش لگنے کے ہمراہ ہو چکے تھے۔ پھر سے سوکھ گئے۔ ندی کے پانی کی روانی تھام گئی۔ جیسے وہ ایک جو ہڑ بن گئی ہوا اور ان کے اروگر دایک و سیع ویراشہ پھیلا ہوا تھا۔

بیگانے دوست

ایک روز آصف بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا اس کا رنگ زرد ہوا رہا تھا۔

”ایلی، وہ بولا۔“ وہ سفینہ پھر یہاں آ رہی ہے۔ اگر وہ آگئی تو پھر میں کیا کروں گا۔ چلو ہم امرتر سے بھاگ چلیں ایلی۔“

”لیکن جائیں کہاں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کہیں بھی۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”نہیں آصف۔“ ایلی نے سنجیدگی سی جواب دیا۔ ”اگر وہاں بھی لڑکیوں نے تمہیں سلام کرنے شروع کر دیے تو۔“

”تو..... تو.....“ آصف سوچنے لگا۔ ”تو میں کیا کروں۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ چلایا۔

”تم ان کی شکایت کرنا چھوڑ دو۔“ ایلی نے سوچ کر کہا۔ ”شکایتوں کی وجہ سے

وہ چڑھاتی ہیں۔ ضد پیدا ہوتی ہے۔ تم خود انہیں سلام کرنا شروع کر دوتا کو وہ خود تہاری شکائیں کریں۔“

”میری شکائیں۔“ آصف گھبرا کر بولا۔ ”نہیں نہیں یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اگر تم انہیں سلام کرنا شروع کر دو گے تو ان کا برتاؤ محبوب کا سا ہو جائے گا۔“ ایلی نے کہا۔ اور وہ تم سے دور بھاگنے لگیں گی۔ انہیں دور بھاگنے کی بھی ایک ترکیب ہے۔

”اچھا۔“ آصف نے تالی بجائی۔ ”کیا یہ چلے گی۔ پھر تو بہت اچھا ہے۔“ آصف سمجھ رہا تھا کہ ایلی اسے مشورہ دے رہا تھا۔ حالانکہ درحقیقت مشورے کے پردے میں وہ اپنی مشکل بیان کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو صحیح سوریے اٹھ کر اسے سلام کرتی ہو۔ کوئی بھی تو نہ تھی جو اس کے لئے بیقرار ہو۔ بلکہ قریب آ کر وہ گٹھڑی کی طرح سمت جاتی تھیں اور کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکتی تھیں۔

”لیکن لیکن آ صف۔“ ایلی نے کہا۔ ”ایسا کیوں ہوتا ہے اگر تم ان کی تلاش میں سرگرد ہو جاؤ تو وہ دور بھاگتی ہیں اور اگر تم ان سے دور بھاگو تو وہ تمہارا پیچھا کرتی ہیں۔“

”ہاں، آ صف گنگیا۔“ مگر میں ان کی تلاش میں کیسے کھو جاؤ۔“ اس کے برعکس ایلی سوچ رہا تھا کہ وہ انہیں اپنی تلاش میں کیسے سرگردان کرے۔ کس طرح انہیں تلاش پر مائل کرے۔

وہ دونوں بہترین دوست تھے لیکن ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ کس قدر بیگانہ۔ ان کی مشکلات ایک دوسرے سے کس قدر مختلف اور متضاد تھیں۔

”اچھا۔“ آصف نے کہا۔ ”تو مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ان پر ظاہر کروں کہ میں ان کا متأثر ہوں۔“

”تم صحیح اٹھ کر ان کو سلام کرنا شروع کرو۔“ ایلی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اور کبھی کبھی دوپہر یا شام کو کوشش کرنے کے لیے کھڑکی سے اے دیکھ لیا کرو۔“

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔“ آصف بولا۔

اور ایلی نے دل میں سوچا اچھا میں کوشش کروں گا کہ کسی کو اپنے لئے سرگردان کروں۔ مائل جستجو کروں۔ All rights reserved © 2002-2003 www.maidan.org.pk

وہ کوچھ

ایلی اب محسوس کرنے لگتا تھا جیسے وہ سخت درمیں بہت آہوات نکا ہو۔ خصوصاً جب وہ اس کوچے میں جاتا تو یہ احساس اس کی رُنگ و پیٹ میں بس جاتا۔ وہاں پہنچ کروہ محسوس کرنے لگتا جیسے زندگی ایک گردا ب ہو جس میں افراد کی چھوٹی چھوٹی قند میں اپنی اپنی دھن میں سلگ رہی ہوں اور گردا ب کے بھاؤ کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار گھوم رہی ہوں۔

جب کبھی شام کے وقت ایلی آغا سے ملنے ان کے یہاں جاتا تو آغا ایلی کو لے کر ڈیورٹسی کے باہر کھڑے ہو جاتے تاکہ کشوے میں چلتے پھرتے لوگوں کا تماشا کر سکیں۔ کشوے میں لوگ پان کھاتے، سگریٹ کے کش لیتے اور نگاہوں کی انگلیوں سے چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقصاؤں کو چھیڑتے۔ اشارے کرتے۔ تماشیں تالگوں میں بیٹھ کر چوباروں کی طرف گرم نگاہیں ڈالتے ہوئے گزر جاتے۔ مزدوروں کے گروہ کوچے میں ٹھلتے۔ تاجر نگاہیں جھکائے قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتے۔ شوقین مزاج دو کامداروں کی نگاہیں گاہوں اور رقصاؤں کے درمیان یوں گھوٹیں جیسے کھڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔

ہر چند گھنٹوں کے بعد کشوے میں کوئی ایسا شخص بھی آنکھتا جسے دیکھ کر لوگوں کی

نگاہیں چوپاروں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتیں۔ بازار میں ایک مدھم سی سرگوشی ابھرتی۔

”کون ہے؟“

”ہائیلے یہ ہے وہ۔“

”کیسے دیکھ رہا ہے؟“

”یارانہ ہے ان سے کیا؟“

اور وہ سرگوشی برف کی گینہ کی طرح لڑکتی لڑکے جاتی۔ حتیٰ کہ سارا کشو اس کی پیٹ میں آ جاتا۔ رقصانہ میں بھی اپنے بے نیاز انداز کو چھوڑ کر بچوں کی طرح بازار کی طرف دیکھنے لگتا۔ اور پھر سماں گوت کیلئے انہیں یادوں کے رہتا کہ وہ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اپنا آپ دکھانے کے لئے وہاں بیٹھی ہیں۔ اس وقت رقصاؤں میں نسایت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور محسوس ہونے لگتا کہ وہ گڑیاں نہیں بلکہ جیتنی جاگتی عورتیں ہیں۔

لکھنؤ، الہ آباد یا مدرس کا کوئی مشہور سازندہ آ جاتا یا کوئی پیر انوکھا بابس پہنچنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشوے میں داخل ہوتا۔ وہاں مشہور ڈاکو اور لشیرے آیا کرتے تھے۔ کروڑ پتی اور گوئی تو اکثر آتے۔ لیکن کشوے میں سب سے زیادہ دھوم اسپکٹر رووف کی تھی۔

اسپکٹر رووف

اگر اسپکٹر رووف آ جاتا تو فوراً بازار پر سنا چھا جاتا۔ پنوڑی کہم کر پیچھے ہٹ جاتے۔ دو کامدار چوپاروں کی طرف دیکھنا موقوف کر دیتے۔ راہ گیر نگاہیں جھکا لیتے۔ ادھر چوپاروں میں سرخی بھرے چہرے زرد پڑ جاتے۔ نگاہوں میں شوٹی کی جگہ گھبراہٹ دوڑ جاتی۔ رقصاؤں میں یوں چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھ جاتیں جیسے طبیعت ناساز ہو۔

اس زمانے میں کشوے پر رووف کی حکومت تھی۔ وہ کشو اس کی ریاست تھی۔ جب شام کے وقت وردی پر سیٹی بیٹھی لگائے۔ سر پڑے دارپگڑی باندھے اپنے باڑی گارڈ کے ساتھ وہ کشوے میں نکلتا تو ایک سرگوشی ابھرتی اور تیزی سے یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور اپنے عقب میں بھیاںک خاموشی چھوڑ جاتی۔

پنواؤزی چوباروں کی طرف تازے کاشغل چھوڑ کر شدت سے پان بنانے میں مصروف ہو جاتے۔ دوکان پر کھڑے شو قین نظریں لڑائی کا خیال موقوف کر دیتے۔ جنرل مرچنٹس کے سیلز میں حساب کتاب کے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔

انپکٹر رووف کی آمد کی خبر من لئے چوباروں میں سازندوں کے ہاتھ لرز کر ممنوع سروں پر جا پڑتے دکھبری سروں پر قیام لمبے ہو جاتے۔ سارنگیاں ناچنا چھوڑ کر رونا شروع کر دیتیں اور مسکراتی ہوئی رقصائیں میں گھبرا کر گانا چھوڑ دیتیں اور کھوئے ہوئے انداز میں پان لگانے بیٹھ جاتیں۔

انپکٹر رووف تمہید کے طور پر کشوے کے دو تین چکر لگاتے۔ پھر کسی چوبارے کے دروازے پر اپنے سپاہی کو متعدد کر دیتے اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچتے۔ ان کے سیڑھیاں چڑھتے ہی وہ ٹلسماں گویا ٹوٹ جاتا۔ اس وقت کوئی پنواؤزی نعرہ لگاتا "علی،" اس کا وہ نعرہ "کن،" بن کر کشوے میں گونجتا اور کشوے میں رکی ہوئی زندگی پھر سے حرکت میں آ جاتی۔ تماش بینوں کی نگاہیں بے باکی سے کھڑکیوں پر منڈ لانا شروع کر دیتیں۔ پنواؤزیوں کی دوکانوں پر کھڑے شرافات پھر سے رقصاؤں کو تازے لگتے۔ رقصاؤں کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تبسم اہرا تا اور ان کے دل سے بو جھا اتر جاتا۔

البتہ جس چوبارے پر انپکٹر رووف چڑھ جاتے تھے وہاں لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہو جاتی۔ محفل برخواست ہو جاتی۔ سیٹھوں اور تاجر چپکے سے نیچے اتر آتے۔

میر اٹی ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے۔

پھر اگر رووف کے حکم کے مطابق وہاں راگ رنگ ہوتا بھی تو سارے گلیاں گانے کی
بجائے میں کوئی طبلہ سر پیٹتا۔ پھر کچھ دیر بعد چوبارے سے اسپکٹر رووف کے
دھاڑنے کی آوازیں آتیں جو نہارے کھڑے میں گوختیں۔ وہ نشے میں چیننا چلاتا
و ہمکیاں دیتا۔ غلیظ گالیاں دیتا اور پھر ایسے لگتا جیسے چوبارے میں دنگا فساد ہو رہا ہو۔
وہ بالآخر بجھ جاتیں اور سکوت چھا جاتا اور کھڑے والے محسوس کرتے جیسے اس
گہری خاموشی سے کراہوں کی آواز آ رہی ہو۔

اسپکٹر رووف کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت جو کھڑے پر اثر انداز ہوتی تھی، پھر
بزرپوش کی تھی۔ جب تھی وہ کھڑے میں داخل ہوتے تو ایک تعجب اور خاموشی بھری
سر گوشی بلند ہوتی۔ پنواڑی پان لگانا چھوڑ دیتے۔ تماش بینوں کی لگا ہیں چوباروں
سے ہٹ کر پھر صاحب کے چہرے اور لباس پر مرکوز ہو جاتیں۔ سیلز میں دو کان کے
اندر ونی حصے سے دوڑ کر باہر آ کھڑے ہوتے اور رقصائص میں جنگلوں پر کھڑی ہو کر
نیچے دیکھنے لگ جاتیں۔

پھر صاحب کے بزر ریشمیں پھر ان کی لانی سیاہ لفیں لھلتیں ان کے سر پر
ریشمیں بزر رومال عربی انداز سے بندھا ہوتا اور ان کا حسین نسائی چہرہ چمکتا اور رسیلی
سیاہ آنکھیں جھکی رہتیں۔ ان کے خدوخال ستواں تھے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے والی
نہیں بلکہ دکھنے والی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی حسین عورت جوگی
لباس پہنے چوبارے سے اتر کر تفریح کھڑے کے بازار میں گھوم کر اپنی نمائش کر
رہی ہو۔

آنچھل اور گھڑیاں

اس کوچ کو دیکھ کرنے جانے ایلی کو کیا ہو جاتا۔ اس کے جسم پر چیزوں نیاں رینگنے
لگتیں اور پھر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ وہیں کھڑا

دیکھا رہے دیکھا رہے۔

اب اس کے لئے آغا کے ملا قاتی کمرے میں بیٹھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ وہاں بیٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس پر نہیں رہا ہے۔ اس کا نداق اڑا رہا ہے۔ ایک رنگیں آنچل اپہرا تا دکھانی دینتا اور پھر بہت سے کپڑے لپٹ کر گھڑی کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ گھڑی اڑھکتی اور کوئی ہستا جیسے نداق اڑاتا۔ ایلی گھبرا کر اٹھتا اور زینے کی طرف بھاگتا زینے میں کھڑی دھم کے ہونٹوں پر پر اسرار تعمیم ہوتا ”آ گئے، آ گئے۔“ وہ آنکھیں مینکار کر کہتی۔ ایلی کو اس کی آواز میں بلا کاظم محسوس ہوتا پھر وہ باہر نکل جاتا اور بازار کے کسی کو نے میں کھڑا ہو کر لوگوں کی طرف دیکھنے میں کھو جاتا۔

کالج میں جب آصف مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ ”ایلی تسلیم۔“ ایک رشیں گھڑی دھم سے ان کے درمیان آ کر گرتی اور اس کا راز کھول دیتی۔ وہ محسوس کرتا کہ آصف اس کے راز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایلی ایک رشیں گھڑی کھولنے کی بہت بھی نہیں رکھتا۔

پھر شام کو وہ دونوں آموں کی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے نور سے ملتے اور نور کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر گاتا اور شیلگن سے بھار آ جاتی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ نور کے لئے شہر سے اتنی دور چل کر آموں کی کوٹھی تک پہنچنا مشکل تھا اور نور کو اس کے گھر سے بلا ناممکن نہ تھا۔ کیونکہ نور محلے کے لڑکوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے یہ گوارانہ تھا کہ کوئی جا کر گھر سے اسے بلائے۔ نور سے ایک جگہ مقرر کر لی جاتی اور ایلی مقرر وقت پر وہاں جا کر نور کو اپنے بائیکسکل پر بٹھا کر بورڈنگ میں لے آتا۔ ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ نور کو یوں بائیکسکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ نور کو یوں بائیکسکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں اسے معلوم نہ تھا کہ کسی لڑکے سے روشنی کی وجہ سے عداوت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک روز جب ایلی سفید چوک میں کھڑا نور کا انتظار کر رہا تھا تو ایک پہلو ان قسم کا شخص آگیا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ ”دیکھ بابو تو نور کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ خون بہہ جائے گا اور تیری کھلوی اتر جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے غصے میں نیل پر ایک گھونسہ مارا۔ پانی کا ایک فوارہ چھوٹا اور ایلی کے کپڑے بھیگ گئے۔

اس روز آصف اور ایلی تن تھا نہر کے کنارے خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ سورج کی سرخ دھاریاں دھنڈلی پڑ گئیں۔ اور دو رشہر کی بیتیاں روشن ہو گرنا پڑے گئیں۔ مگر شبکن سے بھارنے آئی۔ ویریکا وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ایلی نے کہا۔ ”آصف میرا یہاں جی نہیں لگتا۔“

”اچھا۔“ آصف نے مکمل کر کر پوچھا۔ ”تو پھر کیا کیا جائے۔“

”تو پھر میں علی پور سے ہو آؤں لیا۔“ ایلی نے کہا۔

”اس سے کیا ہو گا۔“

”پتھر نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”شايد.....“

”اچھا۔“ آصف نے آہ بھری۔ ”لیکن میں کہاں جاؤں۔“

”کیوں۔ تم تو یہاں خوش ہو۔“

”ہاں خوش ہوں۔ بڑا خوش ہوں لیکن۔“ آصف نے آہ بھری۔ ”لیکن کیا۔“ ایلی نے کہا۔

”معلوم نہیں۔“ آصف نے سر جھکالیا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اب یہ شہر ویران ہو گیا ہے۔ جیسے کچھ باقی نہیں رہا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔“

”اب تو وہ یہاں نہیں۔ اب تو تمہیں کوئی تنگ نہیں کرتی۔“ ایلی نے طفرہ کہا۔ ”ہاں۔“ آصف نے آہ بھری۔ ”اب مجھے کوئی تنگ نہیں کرتی۔“

”پھر بھی تم اداں ہو۔ عجیب بات ہے۔“ ایلی بولا۔

”ہاں.....“ آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”عجیب بات ہے۔ اچھا تم ہو آؤ۔“

علی پور سے۔ ”اس نے آہ بھری۔ ”کاش کمیرا بھی کوئی علی پور ہوتا۔“

اس روز وہ دنوں دیر تک اندر چھیرے میں نہر کے کنارے بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ
و ادکٹری اٹھائے ان کی تلاش میں آپنچا۔

”اُرے یہاں بیٹھے ہو تم دنوں [] وہ چلا یا۔“ اور میں سمجھا شاید نہر میں ڈوب
گئے جو بھی تک نہیں آئے۔ ”ہا۔“ وہ انہیں خاموش دیکھ کر چلا یا۔ ”کیا کر رہے
ہومیاں۔ یوں چپ چاپ بیٹھنے سے مطلب چلوا یا چلو۔“
رات کے وقت لیئے ہوئے ایسی نہ سدت سے محسوس کیا جیسے شبکن گزر گئی ہو
اور بھار کے بعد چاروں طرف خزان کی ویرانی چھائی ہو۔ چاروں طرف ایک لشی
ہوئی دنیا تھی۔ دوسرے کا دھار لاواں آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لہریں ہچکیاں لے رہی
تھیں۔ درخت شائیں شائیں بھر رہے تھے۔ رسولی میں رام و بھدرا آواز میں کچھ
گنگنا رہا تھا اور چاروں طرف گھپ اندر ہبریں مار رہا تھا۔

اس کا خیال تیم کی طرف منعطف ہو گیا۔ ایک گھڑی سی پٹ گئی۔ ایک تھکہ
بلند ہوا اور زرد واداں چھرے ستوں کی اوٹ سے نکل کر جھانکنے لگے۔ بڑی بڑی
سیاہ آنکھیں تمثیر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

گھبرا کر اس نے باور پی خانے کے نل کو گھونٹا شروع کر دیا۔ کتنا غایظ قتل
ہے۔ اس نے جھر جھری لی۔ نہ جانے رامو کہاں ہے کس کام میں لگا ہے۔ شاید برتن
صاف کر رہا ہو۔ شاید رسولی میں بیٹھا ہو۔ اس کی نگاہ پھر قل پر رک گئی۔ اگر اس کے
گرد اینٹوں کا چبوترہ ابنا دیا جائے تو اس کی نگاہ میں نل کے گرد ایک صاف سترہ اچبوترہ
بن گیا۔ ”اوہ بایو۔“ ایک بد معاش اس کی طرف لپکا۔ ”کھلوئی اتر جائے گی تیری۔
ہا۔“ ایسی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ نل سے چھینٹے
اڑ رہے ہیں اور وہ شر اور ہو چکا ہے۔

رینگتی دیواریں

اگلے روز ایلی گاڑی میں علی پور جا رہا تھا۔

بخار کی وجہ سے اس کی کپٹیاں حرک رہی تھیں۔ دل میں دھنکی نج رہی تھی۔
گاڑی ہرے بھرے کھیتوں میں جا رہی تھی۔ یہاں وہاں سبز گھڑیاں بندھی پڑی
تھیں۔

ایک گھڑی قریب آتی۔ فتنا اس میں سے دو حاتما لیدہ ہاتھ ایلی کی طرف لپکتے
اور پھر شیم کی نسی کی آواز سنائی دیتی۔ ”ہی ہی ہی“ علی احمد قہقہہ مارتے۔ ”کشمیر کے
سیبوں پر پلی ہے یا۔“
دوسری گھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ بھنوں کے عین ورمیان ایک تارہ چمکتا۔
جیسے وہ روشن بندی ہو۔ پھر سیاہ جھیلوں میں دیئے روشن ہو جاتے۔

”رے رے رے رے۔“ ارجمند چھائی پیتا۔ ”جب سے اس پنڈورا کی
گھڑی کے پٹ کھلے ہیں اک قیامت لوٹ پڑی ہے محلے پر۔“
لڑکتی ہوئی ایک اور گھڑی قریب آ جاتی اور کھلنے کی بجائے مزید لپٹے جاتی۔
پٹ اور بھی بند ہو جاتے۔ پھر چاروں طرف سے حسین چھرتے جھانکتے۔ ایک قہقہہ
اگھرتا۔ ”بے چارہ بے چارہ۔“

ایلی چونک جاتا۔ وہ اپنے آپ کو جنخ ہو رہتا۔ لیکن گز شستہ خفت کا احساس اس کے
دل پر مسلط ہو جاتا۔ پھر بزرگ گھڑی قریب آ کر کھتی۔

”اے بھول جاؤ ایلی۔ بھول جاؤ۔ میری طرف دیکھو۔ میری طرف۔“
گھبرا کر وہ لا حول پڑھنے لگتا۔ ”یہ میں کیا سوچ رہا ہوں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
پھر شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرا تا۔ ”تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو ایلی۔ تم میں
جرات ہے۔ جاذبیت ہے۔“ ”ہاں ہاں“ شہزاد کہتی۔ ”اب تو ایلی سے ڈر آنے لگا
ہے۔“ اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتی اور دفلتا ایلی دیکھتا کہ وہ اس پر جھک گئی ہے اور سیاہ
جھیلوں پر کنول سے دیئے روشن ہو گئے ہیں۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو شام پڑی تھی۔ بڑی ڈیوڑھی ویران پڑی تھی چوگان میں کوئی نہ تھا۔ چپکے سے وہ گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف دادی اماں کے کمرے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہ چپکے سے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ دادی اماں کا تخت جہاں وہ نماز پڑھ کرتی تھی، خالی پڑا تھا۔ دادی اماں چار پائی پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور سیدہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حمیدہ اور رشیدہ چپ چاپ ایک کوئے میں سہی ہوئی تیجھی تھیں۔

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ”دادی اماں“ سیدہ نے مرکراں کی طرف دیکھا اور پھر ڈاکٹروں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا دادی اماں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے نجیف وزدار آواز میں کہا۔ ”ایلی ہے اچھا اچھا۔“ اور پھر خاموش ہو گئیں۔

اس پر ایلی سیدہ سے چھٹ گیا۔ ”تم اس طرح سے کیوں بیٹھی ہو۔ دادی اماں کو کیا ہے وہ بیٹھی ہوئی کیوں ہیں۔ بولتی کیوں نہیں۔ بولو۔ بولو۔ تم سب خاموش کیوں ہو۔“ سیدہ نے ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اشارے سے بولی۔ ”چل اس کمرے میں یہاں نہیں۔“

جب وہ اس کمرے میں پہنچا تو وہاں ماں کو دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

”ایلی آیا ہے۔“ ہاجرہ چلائی۔ ”کب آیا تو۔“

”دادی اماں کو کیا ہوا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اس کی حالت اچھی نہیں۔“

”بیمار ہے؟“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ تو جا اور فرحت کی طرف۔ اور سو جا کے۔ یہاں ہم جو ہیں۔“

”لیکن مجھے دادی اماں۔“

”اے اپنا ہوش نہیں۔ بہت تکلیف میں ہے جاشاباٹ۔“ ہاجرہ نے منٹ کی۔

”سیدہ“ وہ اس کے داخل ہونے پر چلا کر بولا۔ جواب میں سیدہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔ ”شورنہ بجا ہوش آتا ہے تو وہ بھائی کی طرح رُتپتی ہے۔“ تین دن ہو چکے ہیں۔ بڑے عذاب میں بتتا ہے۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔“ سیدہ نے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

”آدمیلی..... ہاجرہ بولی۔“ اور وہ دونوں چپ چاپ فرحت کے گھر کی طرف چل پڑے۔

”تیری دادی کی حالت اچھی نہیں۔ کیا معلوم کرپ آنکھیں بند کر لے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”لیکن۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”کیا بیماری ہے؟“

”بیماری؟ اب میں اس کا جواب دوں۔“ ہاجرہ مسکراتی۔ ”عمر کا تقاضہ ہے آخر ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے سب کو۔“

ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دادی اماں بہت ضعیف ہے لیکن اس کے مرنے کے متعلق اسے کبھی خیال نہ آیا تھا اور اب اس کے دل پر چوتھی لگی تھی۔

”سب انتظامات کر چکی ہے اپنے ہاتھوں سے وہ“ ہاجرہ نے کہا۔ ”کپڑا تا غریبوں کو بانٹ چکی ہے۔ قل کے لئے چھ منگوا کر رکھ لئے ہیں۔ کل خود ہی ختم دیا۔ کفن کا کپڑا بھی منگوا کر رکھا ہوا ہے۔ بس اب تو گھری پل کی بات ہے۔ جبھی تو میں رات کو ادھر ہی رہتی ہوں۔ لیکن ایلی تو ادھر فرحت ہی کی طرف سوئے۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کرو اپس آ جاؤں گی۔“

”ہوں۔“ ایلی خاموش ہو گیا۔

”تو دادی کے پاس سو کیا کرے گا۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”اے تو اپنا ہوش نہیں اس

کا سانس بگرتا ہے۔ تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اسے۔ تو کیا خدمت کرے گا اس کی۔
اس نے تو کبھی کسی سے خدمت نہیں کرائی آج تک۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ علی پور نہیں بلکہ امر ترہی میں ہو۔ چاروں طرف اداسی
چھائی ہوئی تھی۔ محلے کے اوپرخیلے مکانات خاموش گھرے تھے۔ ناک چندی
ایٹوں کی دیواریں رینگ رہی تھیں۔ دیواروں پر چمکاڑریں منڈ لارہی تھیں وہ یوں
چیخ رہی تھیں جیسے اس کی بیچارگی پر تقصیہ لگا رہی ہوں۔ کھڑکیاں ویران پڑی تھیں۔
جن پر سیاہ تیلیوں کے پروے جھول رہے تھے دور پنجی ہو یہ میں کبڑی لاٹیں سر
جھکائے سوچ رہی تھی۔

فرحت کی طرف جاتے ہوئے ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے علی پور ایک ویرانہ ہواں
کے گرد ایک دھنڈی اور لئی ہوئی دنیا تھی۔ جس میں کوئی بات بھی جاذب نظر نہ تھی وہ
محسوس کر رہا تھا جیسے جینے کے لئے کوئی جواز باقی نہ رہا ہو۔ جیسے زندگی اپنی تمام برگی
اور دلچسپی کھو چکی ہو۔

گال پچکاری

ہائیں۔ وہ گھبرا کر رک گیا اس کے روپ و چوبارے میں شہزاد بیٹھی اس کی طرف
دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ تخت پر سینے کی مشین پڑی تھی۔ جس کے ایک جانب دو بالوں
پاؤں قریب سے رکھے تھے۔ سیاہ جالی کے دو پٹے سے دو سفید نکل کر مشین کو تھامے
ہوئے تھے۔ ریشمیں ملبوس کے اوپر ایک مثبسم چہرہ، دونوں کیلی آنکھیں اور ان پر
پیشانی کا سیاہ تل۔ گھبرا کر ایلی نے نگاہ جھکائی۔

شہزاد کے سرخ حنا مالیدہ ہاتھوں نے جیسے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا۔
سرخ بوندیاں ناچنے لگیں۔ ایلی اڑ کھڑا گیا۔

”تو آ گیا ایلی؟“ شہزاد نے مسکرا کر پوچھا۔ ”ادی کی بیماری کی خبر سن کر آیا
ہے؟“

”نہ۔ نہ نہیں تو۔“ ایلی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”آپ بیہاں ہیں۔“ دفعتاً اس غیر متحرک تصویر میں جنمیش ہوئی۔ ایک چمک لہرائی چھپتی ہوئی چمک ہاں۔ ”شہزادی شہزادی چلاتے ہوئے بولی۔“ اب کی بار میں ان کے ساتھ نہیں گئی۔

میں نے کہا کچھ دیر بیہاں رہ لوں بیٹھ جا تو۔

”کھڑا کیوں ہے تو؟“

ایلی بیٹھ گیا اور شہزادی کی طرف دیکھ کر ہو چکے لگا۔ شہزادہ اسرا اٹھا کر دیکھتی تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہست چمکتی عجیب سی مسکراہست ایسے محسوس ہوتا کہ گال بھری پچپکاری چل گئی ہو جیسے شہزادہ بہت قریب آگئی ہو بہت قریب۔ اتنی قریب کہ قرب کی وجہ سے ایلی کے بند بندیں بتیاں آئی روشن ہو گئی ہوں جیسے اس نے نہ جانے کیا پالیا ہو لیکن جب شہزادہ آنکھیں جھکایتیں تو ایلی محسوس کرتا جیسے گھٹاٹوپ اندر ہیرا چھا گیا ہو چاروں طرف ویرانی اور اداسی چھا جاتی اس وقت ایلی کو شہزادے کے حنا مالیدہ ہاتھوں سے گھن آئے لگتی اس وقت وہ محسوس کرتا جیسے وہ تنگا ہو۔ جیسے اس کا وجود باعث نگ ہو۔ احساس ندامت سے اس کا سر جھک جاتا اور وہ دل ہی دل میں لا حول پڑھنے لگتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوتی کہ شہزادہ ایک بار پھر زگاہ اٹھا کر دیکھے۔ اس منور پیشانی سے بجلی چمکے چھوٹی چھوٹی بتیاں یوں روشن ہو جاتیں جیسے گال بھری پچپکاری چل گئی ہو اور شہزادے کے حنا مالیدہ ہاتھوں کی پچپکاری سے گال کی پھوار پڑے۔ شہزادہ کا اندماز عجیب ساتھا۔ جب وہ مسکراتی تو فضا میں اشبات کی چھلکھڑیاں چل جاتیں۔ لیکن جب وہ سنجیدہ ہو جاتی تو بے نیازی کا دیزیز پر دہ پڑ جاتا اور پھر وہ گویا ایلی کی موجودگی اور گویا وجود سے بھی بے تعلق ہو جاتی۔ نہ جانے کیا سحر تھا یوں الحج بھر میں اس قدر قریب آ جاتا اور پھر دوسرے لمحے میں جیسے کوئی کوسوں دور ہو۔

ایلی اکثر سوچتا تھا کہ وہ خصوصی مسکراہٹ کیا تھی جو قرپ کا احساس دیتی تھی۔ نہ

جانے اس کی مسکراہٹ میں کیا جادو تھا۔ جیسے کوئی ان جانی شہلگن آگئی ہو۔ اس نے کئی بار رفیق کی بیوی کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی تھی مگر رفیق پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ گال کی اس پچکاری تلے کھڑے ہو کر بھی وہو یہی خشک رہتا اور پھر تیوری چڑھا کر خشک آواز میں انسے فانٹا، دو پتھر سنجھا لو سر نگاہوا جا رہا ہے۔ ”اور پھر باہر نکل جاتا۔

کئی بار شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ شہزادی کی آنکھوں میں وہی تمہم کی لہر چمک رہی ہے اور اس نے محسوس کیا تھا جیسے شہزادی واضح الفاظ میں اپنے خاوند سے کچھ بھائہ رہی ہو۔ جیسے دور کھڑنے لامبے کے باوجود وہ اس کے قریب آگئی ہو۔ اس کی گود میں بیٹھی ہو۔ شریف اس کے جواب میں گھورتا تو نہیں تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں حسرت کی جملہ ادائی جھلکتی حسرت اور ادائی، اور پھر شہزاد اس کی حسرت بھری ادائی کو محسوس کر کے چوکتی۔ وہ بتی بجھ جاتی، اور گھٹاٹوپ اندر ہیرا چھا جاتا۔ ایسی چمک اس نے مردوں کی آنکھوں میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہاں عورتوں کی آنکھوں میں کئی بار دیکھی تھی، لیکن عورتوں کی آنکھوں میں نہ جانے کیا ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ نگاہ کیا تھی، مسکراتی تو وہو یہی بھی تھیں لیکن ہر مسکراہٹ میں وہ بات پیدا نہ ہوتی تھی۔

شہزاد اکٹھ مسکرا کر ایلی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ مسکراہٹ محض سطحی ہو لیکن شریف کی طرف دیکھ کر مسکراتی تو ایلی تڑپ اٹھتا۔ وہ مسکراہٹ حام مسکراہٹ سے کس قدر مختلف ہوتی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی طرف بھی وہی مسکراہٹ لہرائے۔ ویسی ہی مسکراہٹ سے دیکھے۔ ان دنوں ایلی کی سب سے بڑی آرزو اور حسرت وہ مسکراہٹ تھی۔

ایلی کے جسم کا بند بند اس نگاہ کا بھوکا تھا اور پھر شہزاد سے ”میرے ایسے نصیب کہاں۔“ وہ سوچتا کہ شہزادی میرے طرف وہ نگاہ ڈالے۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ محسوس

کرتا کہ وہ گال بھری پچکاری چلا ہی چاہتی ہے اور وہ شر اور ہوا ہی چاہتا ہے۔ لیکن دفعہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بات بگڑ جاتی، گال کی جگہ دو ایک پھول پتیاں برستیں اور پھر مطلع غبار آ لو وہ ہو جاتا۔ پھول پتیوں کا کیا تھا وہ تو ہر یہم پر اڑا کرتی تھیں۔

پچھو دیرا میلی شہزادے کے سامنے بیٹھا رہا۔ پھر اس کے لئے وہاں بیٹھے رہنا ممکن ہو گیا۔ شہزادے جانے کیا تھی۔ اس کے چہرے پر ایک وقار تھا۔ بے حسی تھی۔

”ایلی اٹھ بیٹھا۔“ اچھا بیٹا میں جاتا ہوں فرحت انتظار کرو ہی ہو گی۔“

”اچھا تو میں آئے۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر ہی کہا۔ میکن چائے یہاں پینا ٹھیک ہے۔“

”اچھا تو میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ فرحت کی طرف چل پڑا۔

احساس عظمت

ٹھیک صدر انندھیری کو ٹھری کے ساتھ والا کمرہ صاف کر رہا تھا۔

”ہائیں ایلی ہے۔“ صدر اسے دیکھ کر چونکا۔ ”چھٹی لے کر آئے ہو؟“

”داوی اماں۔“ صدر نے دانت پیسے۔ وہ نہیں مرے گی وہ کبھی نہیں مرے گی

وہ مرے تو میں پارٹی دوں گا۔ ضرور دوں گا ایمان سے مذاق نہیں۔“

ایلی کو صدر کی بات اچھی نہ لگی۔

”آؤ۔ آؤ۔ بیٹھ جاؤ ایلی۔“ صدر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

ایلی بہت خوش تھا کہ محلے کا ایک بڑا لڑکا اسے اتنی اہمیت دے رہا تھا اور پھر وہ

لڑکا جسے تھیڑ کی پارسی لڑکی سے عشق تھا۔

”تم مجھ سے کبھی نہیں ملتے ایلی۔ میرے پاس بھی آ کر بیٹھا کرو۔ اور وہ کے

پاس بیٹھتے ہو تو ہمارے پاس بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔“

ایلی کو صدر کی باتیں سمجھ میں نہ آ رہی تھیں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ اس کے بازو

عجیب انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں بازو پر فلیے حروف میں کچھ کھدا ہو تھا۔

شاید اس پارسن کا نام ہوا میلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان نئیے حروف کے متعلق صدر سے پوچھنے لیکن اس میں ہمت نہ پڑی۔

اگرچہ صدر اس وقت کرے کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ لیکن کبھی کھاروہ رک جاتا اور اس کی آنکھوں میں چمک لہراتی۔ سرخ بوندیاں اڑتیں۔ لیکن جلد ہی وہ چمک ماند پڑ جاتی اور محرومیت کے بادل چھا جاتے وہ ایک آہ بھرتا۔ اس کے ہونٹوں میں وہی جنبش ہوتی۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“ کی جنبش، پھر وہ ترپ کر مرتا اور ایلی سے کہتا۔ ”ایلی تم شریف کے پاس بیٹھا کرتے ہو۔ لیکن میرے پاس تم کبھی نہیں آئے۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کا رشتہ زیادہ قوتی ہے۔ اچھا۔ اچھا آج چائے اکٹھے پینے گے؟“

میں اس وقت چوبارے سے شہزادی آواز آئی۔ ”ایلی۔“ شہزادی آوازن کر صدر چونک پڑا اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کا بند بند رقص کر رہا ہو۔

”ایلی چائے تیار ہے آؤ بھی نا۔“ شہزادی آواز گنجی۔

شہزادی آوازن کر بھی چونک جاتے تھے۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا اثر تھا۔ اس کی آواز محلے والیوں کی آواز سے قطعی طور پر مختلف تھی جسے سن کر یوں محسوس ہوتا جیسی ویرانی میں کوئی اڑتا ہوا پچھی تان اڑا گیا ہو، یا جیسے گھور گھٹا میں سورج کی کوئی کرن چمک گئی ہو۔ اس کی آوازن کر محلے کے بزرگ بھی چونک پڑتے تھے۔ اور پھر کسی سے پوچھتے۔ ”یہ شہزادی ہے نا؟“

صدر نے ایلی کی طرف محروم نگاہوں سے دیکھا۔ ”ہاں بھی۔“ وہ بولا۔ ”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ کون کچھ کہہ سکتا ہے۔“ اس نے ایلی سے یا اپنے آپ سے کہا۔ ”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”کبھی تم ہم دونوں اکٹھے چائے پینے گے۔“ ایلی صدر کے کمرے سے باہر لکھا تو فرحت کھڑی تھی۔ ”ایلی تو کب آیا؟ مجھے تو

پتھے ہی نہیں تھا کہ تو آیا ہے۔ ”وہ حسرت بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ”اگر میں شہزادی کی آواز نہ سنتی تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ تو آیا ہے چلو شکر ہے کہ ہم تیرانام تو سن لیتے ہیں شہزادی کی زبان ہی سے ہی۔ چائے تو ہمارے یہاں بھی تیار ہے۔“

”مگر.....“ اس نے شہزادی کے چوبارے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا ”تجھے فرصت مل جائے تو آئیو آئے گا۔ ضرور آتا۔“ فرحت کی آنکھوں میں نبھی نبھی دیکھ کر ایلی رزگیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ سب ایلی کی طرف سے اس قدر مایوس کیوں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان کی ان کی شکایات کا کیا جواب دے گران جانے میں ایلی میں ایک احساس برتری لہریں لے رہا تھا۔ اسے اپنی عظمت کا احساس ہوا جا رہا تھا اگرچہ اس کی بھجوئیں خدا تھا کہ وہ احساس عظمت کس وجہ سے ہے اور وہ سب اس سے مایوس کیوں تھے اور ان کا انداز حسرت زدہ کیوں تھا۔ یہ سوچتا ہوا وہ شہزادی کی طرف چل پڑا۔

بے نیاز درzen

جب وہ داخل ہوا تو شہزادی طرح بیٹھی مشین چلا رہی تھی اور اس کی نگاہ رشیمیں کپڑے پر جمی ہوئی تھی۔

”آگئے تم۔“ اس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ”ویکھو تو کب سے چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

میز پر چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چند ایک ساعت تو ایلی منتظر رہا کہ ابھی شہزاد آنکھ اٹھا کر اس کی دیکھے گی لیکن وہ جوں کی توں کام کرتی رہی۔ آخر وہ سوچنے لگا کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنا ہے کی لیکن اٹھ کر چائے تو بنائے گی مگر جلد ہی اس کی غلط نہیں دور ہو گئی۔

”اب پی بھی لوٹا چائے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے بھی ایک پیالہ بنادو۔“ ایلی کے تمام سہانے خیال صابن کے بلبلوں کی طرح پھوٹ گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے گردو پیش دھندا رہے ہوں۔ جیسے وہ گرا جا رہا ہو۔
بلند یوں سے پنج کی طرف لڑک رہا ہو وہ احساس برتری کافور ہو چکا تھا۔ وہ
سوچنے لگا ”میں چائے کا بھکاری تو نہیں جو میز پر رکھی ہے۔“ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر
بھاگ جائے اور اپنے آپ کو اُن برتر اور بے نیاز درجن سے محفوظ کر لے، لیکن اٹھ کر
کر بھاگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ پھر دفترا سے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ میرے لئے
بھی بناؤ ایک پیالہ، ڈوبتے کوئنکے کا سہارا مل گیا۔ میرے لئے بھی بناؤ ایک پیالہ۔
اس ایک فقرے میں جاؤ وہ قلتی اچھی ہے شہزادی۔ وہ محسوس کرنے لگا اور پھر چائے
بنانے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز صح سویجے ہی شہزادی سے آئندوار ہوئی۔ ”چلو ایں۔“ وہ بولی۔
”میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ چائے کے ٹھنڈگی ہو رہی ہے۔“
”یہاں جو بنی ہوئی ہے۔“ فرحت بولی۔ ”دونوں بیٹھ کر میں کیوں نہیں پی
لیتے۔“ فرحت کے انداز میں طنز تھی۔

”یہاں نہیں۔“ شہزادی کر بولی۔ ”چائے کامزرا کیلے میں آتا ہے۔“
”تو جبھی ایں کو بلانے آئی ہو۔“ فرحت نے پھر وار کیا۔
”ہاں۔“ شہزادی قہقہہ لگایا۔
”مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“ فرحت بولی۔
”نه بھائی۔“ شہزادی جواب دیا۔

”معلوم ہوتا ہے شریف جاتے ہوئے ایں کو تمہیں سونپ گیا ہے۔“
”ہاں۔“ شہزادی مسکراتی۔ ”وہ کہہ گئے ہیں کہ ایں کو چائے پر ضرور بدلایا کرنا۔“
”اوہ۔“ فرحت شہزادی کی دلیری پر گھبرا گئی اور ایں چپ چاپ شہزاد کے پیچے
پیچے چل پڑا۔

جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچ تو شہزاد حسب معمول مشین کے سامنے بیٹھے

کروں۔ ”ایک پیالہ مجھے بھی بنادو۔“ اور خود کام میں مصروف ہو گئی۔

دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا اور شہزاد پڑے سینے میں منہمک رہی۔ چائے پی کر جب وہ نیچے اتر اتو اندر ہیری کوٹھری میں صدر کھڑا حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنپھے ہوئے تھے جیسے ”حافظ خدا تمہارا۔“ گلگنانا بھول چکے ہوں۔ ایسی کوڈ دیکھ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ آگئی۔ نہ جانے وہ کیوں اس کی طرف حسرت سے دیکھتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ چلا کر کہے دیں نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھ سے چائے بننا کر پی ہے۔ میرے ساتھ ہمیز پرکشی نے چائے نہیں پی، لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی۔ چوگان میں عورتوں نے اس کی طرف معنی خیز نکاحوں سے دیکھا۔

”اے ہے۔“ ایک بولی۔ ”ایسی آیا ہے۔“

”میں کہہ رہی ہوں۔ یہ کیا گور کھو دندہ ہے۔“ چاچی بولی۔ ”وادی تیری اس طرف بیمار پڑی ہے۔ ہن تیری ادھر ہے تو اس ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا ہے۔“

”ہائے چاچی۔“ دوسری نے کہا۔ ”آج کل کے لڑکے گھر پر کہاں بیٹھتے ہیں۔“

”نہ لڑکی۔“ چاچی نے پینتر ابدالا۔ ”ہمارا میلی ایسا نہیں۔ ہو گا کوئی کام آخر پڑ جاتا ہے اور وہ لڑکی۔“ اس نے کان سے منہ لگا کر کچھ کہا اور پھر ہٹنے لگی۔

”دیکھ لو زمانے کے رنگ ہیں چاچی۔“

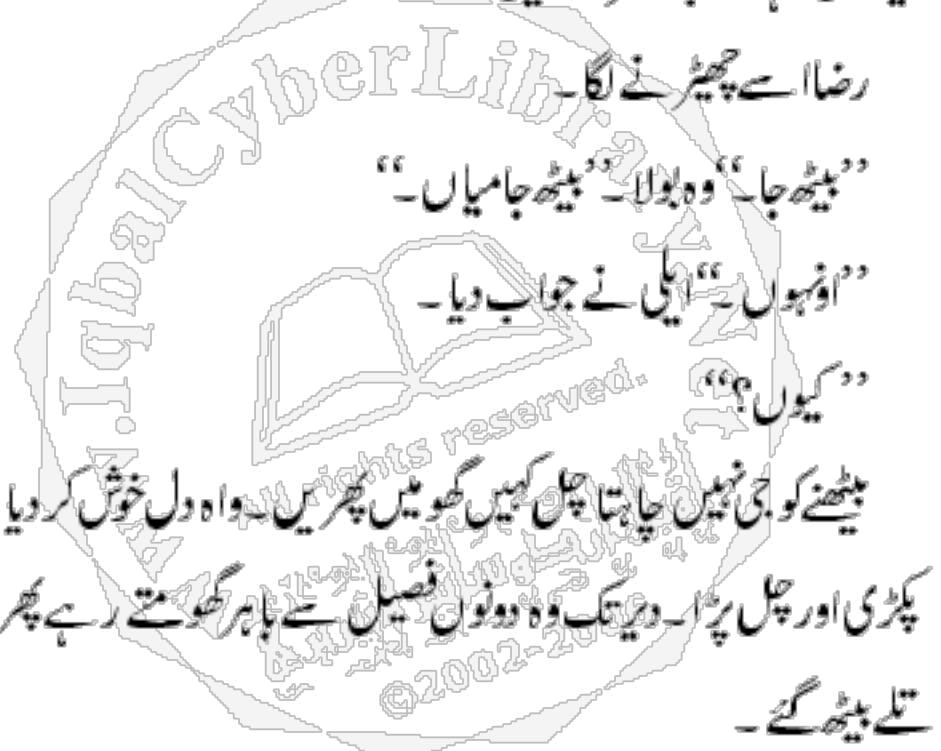
”یہی تو دیکھ رہی ہوں تو پہ کیا زمانہ آیا ہے مگر ہمارا میلی ایسا نہیں۔“

کیا کروں

پھر رضا آگیا۔۔۔ ”ٹھیک ہے بابو اب کیوں ہمارے پاس آنے لگے تم۔ اب تو بس چوباروں میں بیٹھ کر چائے اٹتی ہے۔ لوگ بلا بلا کر پلاتے ہیں۔ مگر بابو جب اونچے چوباروں سے کوئی گرے تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ہے ہاں۔“ اس نے اپنی لگنگڑی ناگ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یقین نہ آئے تو یہ دیکھ لو۔“

”بکواس بند کرو۔“ ایلی نے بات مذاق میں نالے کی غرض سے کہا۔

”کیسے کروں بند۔“ رضا ہنسنے لگا۔ ”اپنا تو کام ہی بکنا ہے۔ سن امر تر والوں کا کیا حال ہے۔ اب تو مزے ہیں نہ۔“



”بیٹھ جا۔“ وہ بولا۔ ”بیٹھ جامیاں۔“

”اوہ ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

بیٹھنے کو جی نہیں پاتا چل کہیں گھو میں پھر ہیں۔ وہ دل خوش کر دیا رضا نے لائھی پکڑی اور چل پڑا۔ دیریکٹ وہ دنوں ان فصلیں سے باہر گھومتے رہے پھر ایک درخت تلنے بیٹھ گئے۔

”رضا۔“ ایلی بولا۔ ”میرا جی نہیں لگتا۔“

”جی لگ جائے بایو تو پھر بھی نہیں لگتا۔“

”کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا۔

”سارے محلے میں تیری تسلیم کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

”لیکن رضا تسلیم تو میرے سامنے نہیں آتی کئی جتن کرو یکھے۔“

”تسلیمیں سامنے نہیں آیا کرتیں ایلی۔ سامنے آ کھڑی ہوں تو پھر بات ہی کیا ہے۔“ رضا نے کہا۔ ”یہ تو ہوتا ہی ہے۔“ پھر ایلی امر تر کی باتیں سناتا رہا اور رضا قہقہے مار کر ہستارہا۔

سیر کر کے جب وہ واپس آئے تو رضا سے رخصت ہو کر ایلی دادی اماں کی طرف گیا دروازے میں ہاجرہ کھڑی تھی۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”جا فرحت کی طرف دوڑ جایہاں سے۔“ ”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کہا جو ہے تم سے۔“ وہ بولی۔ ”وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہے۔ آنکھیں

کھولنے کی سکت نہیں رہی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اپنا دل بردا کرے گا تو۔ جا فرحت
تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔“

وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑا۔

شام کو جب وہ شہزادے کے چونبارے میں پہنچا تو پھر بارے سے ملحوظ چھت پر پانچ
چھ چار پائیں پہنچی ہوئی تھیں اور فرحت اور شہزادے چار پائیں پہنچی باتیں کر رہی تھیں۔

”تو آ گیا ایں۔“ فرحت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اچھا کیا تو نے کہ چلا
آیا۔ دادی اماں کی حالت بھی نہیں۔ نہ جانے کہ۔“

.....
رہ رک گئی۔ ”اماں تو کئی راتوں لہے ادھر ہی رہتی ہیں، آج کی
رات..... شاید مجھے بھی جانا پڑے۔ اسی لئے میں نے یہاں چار پائیں پہنچوا دی
ہیں تاکہ پچھے اکیلے نہ رہیں۔ ٹھیک ہے ناشہزادے۔“ ”وہ ہے تیری چار پائیں ایں۔
وہ کونے والی۔“

شہزاد

سانپ اور سپیرا

رات کو شہزاد کی طرف دیکھے بغیر ایلی اپنی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔ صحن میں چاند کی چلکی ہوئی تھی روبہ بھی چاندنی میں شہزاد کے دو بالوں میں پاؤں کہیں رکھے ہوئے تھے اور سیاہ جالی دار دوپٹے میں اس کی دو دھیا پیشانی پر ایک سیاہ بیر بہولی چمنی ہوئی تھی۔ دو نوکیں آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ گھبرا کر ایلی نے دیوار کی طرف منہ موز دیا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد دادی انماں کی طرف سے پا جرہ نے فرحت کو آواز دی۔ ”اہر آنا۔ جلدی۔“

”خدا خیر کرے۔“ فرحت نے گھبرا کر کہا اور ماحقة کوٹھا پھلانگ کر دادی کی طرف چل گئی۔

فرحت کے جانے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نہ جانے شہزاد اپنی تھی کیا کر رہی تھی۔ ایلی نے شہزاد کی طرف نہ دیکھنے کا عزم کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی نگاہوں تلے سیاہ جالی دار دوپٹے کا پلواڑ رہا تھا۔ شفاف پیشانی پر سیاہ بیر بہولی رینگ رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اسے احساس ہوتا کہ وہ شہزاد کے متعلق سوچ رہا ہے پھر وہ گھبرا کر اپنی توجہ کسی اور طرف مبدل کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔

”سو گئے ایلی۔“ قریب ہی شہزاد کی آوازن کروہ چونک پڑا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”غہیں تو جاگ رہا ہوں۔“

”اوہ..... میں سمجھی سو گیا ہے۔ لیکن یوں چپ چاپ کیوں پڑا ہے تو“ وہ بولی ”اوہ کیا اٹھ کرنا چوں۔“ ایلی نے جل کر کہا۔

”ناچ تجھے کون منع کرتا ہے۔“ وہ پچوں کی طرح ہنسنے لگی۔

”اکیلے میں تو ناچا بھی نہیں جاتا۔“ وہ بولا۔

”تو کیا اکیلا ہے۔“ شہزادے اشارتاً سے امر تریا دو لانے کی کوشش کی۔

”اکیلا ہی تو ہوں۔“ ایلی نے لمبی آہ بھری۔

وہ قہقہہ مار کر نس پڑی۔ ”اوہ میں بھی امر تریا دا رہا ہے تھے۔“

”امر تری؟“ وہ گھبرا گیا۔

”تسالیم۔“ شہزادے جھک کر اسے آداب کیا اور پھر منے گئی۔

ایلی کامنے نقی ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا کہ شہزادہ اور امر تریا اور تسلیم کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔

”کبھی تسلیم سے ملاقات کی ہوئی ہے؟“ شہزادے اس کے قریب آ کر پوچھا اور پھر اس کی چار پانی پر بیٹھ گئی۔

ایلی کے جسم پر چیزوں بیاں رینگنے لگیں اسے محسوس ہونے لگا جیسے گرمی کی ایک لہر اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان جانا اضطراب اس پر چھائے جا رہا تھا۔ ایک سرخ دھنڈ لکھا اس کی کنپیوں میں تحرک رہا تھا۔ صحن میں زرد چاندنی اور گدرے سایوں کی عجیب سی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی چوبارے میں اندھیرا رینگ رہا تھا۔ مسجد کے گنبد کے اوپر چوکا دڑیں چیخ رہی تھیں۔

”یاد آتی ہے تمہیں۔“ شہزادے ایلی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”جبھی یوں چپ چاپ پڑا رہتا ہے تو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔

شہزادے اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ سفید ہاتھوں پر حنائی رنگ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔

”اچھا۔“ وہ نہی۔ ”اگر وہ یاد بھی نہیں آتی تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا؟“

”فائدہ۔“ اس نے شہزادی کی اڑتی ہوئی لٹ کی طرف دیکھا۔
”اچھی محبت ہے یہ۔“ وہ بولی۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے وہ قرب نہ جانے کیا کر رہا تھا جیسے اس چھپیر رہا ہو۔ اس کی قوت عمل و حند لالی جاری تھی، نہ جانے قرب کی وجہ سے یا کسی ان کہے ڈر سے جو اس کی نسou میں دھنگی کی طرح نکلا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اس کی آواز کی لرزش روزگار نہ کروے گی۔

”میں پانی پی لوں۔“ ایلی نے گھبرا کر کہا۔

”میں پلاتی ہوں۔“ میں پانی، شہزاد کھڑی ہوئی۔

ایلی کا بھاگ جانے کا یہ بہانہ تھی ہے کہ رہو گکر رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا گھرے کے پاس شہزاد گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ اس کے گرد چاندنی اور انہیں رے کی بساط اچھی ہوئی تھی اور اس بساط پر ملکہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر اڑتے ہوئے بالوں کا تاج تھا۔ ”یہ لو۔“ شہزاد کا حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی جھبک کر پیچھے ہٹا۔

”لو بھی،“ ہاتھ اور قریب آگیا ایلی کا جی چاہا کہ پانی کے گلاس کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑے اور پھر پھر۔۔۔ مگر پھر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا۔۔۔ ایک سرخ و حند لکا۔

چجچج۔ ایک چمگادڑ کہیں قریب سے ایلی کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شہزاد نے گلاس چھوڑ دیا ایلی شرابور ہو گیا۔ شہزاد کی سریلی بنسی سے فضا گو نہ بننے لگی۔ ”بالکل ہی مجنوں بن گئے۔“ وہ چلانی۔ ”لاؤ میں پونچھ دوں۔“ وہ ہنسنی ہوئی آگے بڑھی۔ سرخ ناگ پھن پھلانے پھر اس کی طرف لپکا بوا کا ایک ریلا آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سرخ دیوالی اس پر مسلط ہو گئی۔ اس نے لپک کر اس رنگیں سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جیسے وہ سپیرا ہو۔ اسے اپنی طرف کھینچا۔ نہ جانے محض جنون کی

مجبہ سے۔ محبت سے نفرت سے یا اس خوف کی وجہ سے جو اس پر مسلط و محبط تھا۔ اس کی دیواںگی اور بھی شدید ہو گئی۔ اس نے ایک تازہ جھنکا دے کر دیوانہ وار اسے اپنی طرف کھینچا۔ یوں بے دردی سے کھینچا۔ جیسے شہزادِ محض ایک رنگیں گڑیا ہو۔ شاید وہ اسے دانتوں سے کاشنا چاہتا تھا تا کہ کامے جانے سے پہلے اس کی گردان چبائے اور اپنے آپ کو محفوظ کر لیں اس کے گرم لمس سے ایلی کے ہونک جلنے لگے اور ان جانے میں اس نے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ شہزادِ چارپائی پر یوں گرچکی تھی جیسے ایک بار پھر موئیا گھٹڑی میں تبدیل ہو گئی ہو۔

All rights reserved
© 2002

ایلی کی نگاہ میں وہ نہ چاندنی سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے نضا میں گال کی پچکاریاں چل رہی ہوں۔

عین اس وقتِ لمحہ کو ٹھنے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔ ”تم سو گئے کیا؟“

فرحت کی آواز سن کروہ خونیں ٹلسٹم ٹوٹ گیا۔ ایلی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گھٹڑی لپک کر کھڑی ہو گئی اور ایلی لیٹ کو یوں چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے عرصہ دراز سے سورہا ہو۔

”تم آ بھی گئی۔“ شہزاد نے کہا۔

”اماں نے بھیج دیا۔“ فرحت بولی۔

”کیا حال ہے اب۔“

”اچھا نہیں۔ شاید آج کی رات.....“

”بیچاری کی جان چھٹے۔“

”میں کبھی تم سوچ کے ہو گے۔“ فرحت نے کہا۔

”نہیں تو۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی تو جاگ رہے ہیں۔“

”اور ایلی تو غالباً سوچ کا ہے۔“ فرحت نے ایلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ابھی تو باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے۔“ شہزادی آواز میں کسی قسم کی لرزش نہ تھی۔

وہ یوں کوٹھے پر ادھراً دھرم رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اگر لیکن

ایلی پسینے میں شہزادی کے پیشہ مانی ہو رہی تھی۔ میں نے کیا کر دیا۔ کیوں کیا۔ اگر شہزادی نے فرحت سے کہہ دیا تو۔ اگر اس نے شریف کو بتا دیا تو وہ کیا کہے گا۔ مجھ سے فرحت کرنے لگے گا۔ دونوں مل کر تمسخر ہے نہیں گے۔ اس تمسخر کو محسوں کر کے اس کا سائز رک گیا۔

لیکن شاید شہزادی کو نہ بتائے۔ شاید وہ اس راز کو چھپا لے۔ ابھی تک تو اس نے فرحت سے اس بارے میں بات نہیں تھی۔ شاید وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ کب ایلی کہیں جائے اور وہ ایلی کی حماقت کا قصہ بیان کرے۔ فرحت اور ہاجرہ سن کر کیا کہیں گی۔ کہیں گی۔ آخر پیٹا کس کا ہے۔ اس خیال پر اس کے روئے کھڑے ہو گئے۔

لیکن شہزاد کا رویہ بے نیاز گی اور بے پرواہی کا مظہر تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے ایلی کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید وہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا اگر نہ بھی بتائے تو بھی وہ اپنے دل میں اسے ذمیل سمجھے گی۔ اس کی اس مذموم حرکت پر رنجیدہ ہو گی۔ ممکن ہے اب کبھی اس کے قریب نہ آئے اور آئے بھی تو فرحت سے ناک سکیٹر لے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے شہزاد کی چھم سے محروم ہو جائے گا۔ کیا وہ اسے دیکھ کر کبھی نہ مسکرائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تھخی بتیاں روشن نہ ہوں گی اور وہ گلال بھری پچکاری..... نہیں نہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ شہزاد فرحت سے شکایت کر دے۔ ہاجرہ سے کہہ دے۔ شریف سے کہہ دے۔ جس سے جی چاہے کہہ دے۔ مگر اپنا انداز نہ بد لے ہاں ہاں۔ میں اس

سے معافی مانگ لوں گا۔ ہاتھ جوڑ دوں گا اور جب وہ معاف کر دے گی تو منت کر کے کہوں گا۔ ”میری ایک بات مان لوخدائے لئے صرف ایک بات۔ اپنے ہاتھوں پر مہندی نہ لگایا کرو اور اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنا ہاتھ میرے اس قدر قریب نہ لایا کرو۔“

چارپائی پر پڑھے پڑھے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سر پر انڈھیرے کا ایک بہت بڑا مگر امند لار باتھا اور شیش محل کی سب سے اوپری منزل میانی چاندنی میں اپنی بے نور کھڑکیوں سے اس گی طرف گھور رہی تھی۔ قریب ہی شہزاد فرحت سے با تینیں کرتے ہوئے نہ رہی تھی۔

شہزاد کی بُنسی سن کرو، چونک پر اے۔ وہ اس بیوں رہی تھی۔ وہ با تینیں کیوں کر رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید وہ اس کی اس حرکت کو درخور اغتنانہ سمجھتی ہو۔ اس خیال پر وہ کانپ گیا۔ اگر اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی تو..... اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور وہ اضطراب میں کروٹیں بد لئے لگا۔

”لویہا اور دیکھو۔“ شہزاد بُنسی۔ ”ویسے سویا ہوا ہے لیکن کروٹیں لئے جا رہا ہے۔“ فرحت نے سمجھی گی سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی خیال نہیں کیا سوتے میں ہمیشہ کروٹیں لیتا ہے۔“

”اچھا۔“ شہزاد کی آواز میں طنز تھی۔ سوتے میں جا گتے کی سی حرکتیں کرتا ہے اور جا گتے میں سوتے کی سی عجیب بات ہے۔“

فرحت شہزاد کی بات سمجھنے سکی۔ البتہ ایلی کی پیشانی پر چند قطرے نمودار ہوئے اور وہ سوچنے لگا کہ شہزاد کی آواز میں کتنی طنز تھی۔ ضرور اس نے اس کی اس حرکت کا برآманا تھا۔ ضرور برآمانا ہو گا۔ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ اس گھر میں آنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے خیال آتا کہ شکر ہے اس نے کچھ تو مانا اسے اچھا نہ سمجھا۔ اگر وہ کچھ بھی نہ سمجھتی تو..... اس خیال پر اسے خوشی تو ہوتی،

مگر پھر وہی فلر سوہان روح ہو جاتا۔ نہ جانے اب وہ کیا کرے گی۔

آہستہ آہستہ فرحت اور شہزاد کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور ان کی باتوں میں وقہ بڑھتے گے۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سنانا چھا گیا۔

وہ چونک کر جاگ پڑا۔ اس نے مگر چوری چوری فرحت اور شہزاد کی چار پائیوں کی طرف بیکھا۔ انہیں چپ چاپ پڑے دیکھ کروہ پانی پینے کے بھانے اٹھ بیٹھا۔ فرحت چارپائی کے ایک پہلو پر تکمیلی ہوئی پڑی تھی۔ اس سے پرے شہزاد چارپائی پر یوں بچھی ہوئی تھی جیسے پینگ پوش بچھا ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بہمی مسکراہٹ تھی۔ ایک ماٹھ ساتھ وہ ای چارپائی پر اپنی تھنخی بچی صبیحہ پر پڑا تھا۔ جیسے تحکمتے تحکمتے سو گئی تھی۔ ایلی نے شدت بے محسوس کیا کہ کاش وہ صبیحہ ہوتا اور شہزاد کا ہاتھ اسے تھپکتا۔

وغذا اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ہاتھ اسے تھپک رہا ہواں کے بدن میں چیزوں کا چلنے لگیں۔ سرخ ہنگ پھن اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔ ایلی کسی شدید جذبہ سے متاثر ہو کر شہزاد کی طرف بڑھا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس رنگیں پھن سے لپٹ جائے اور پھر وہ سے جانے کے بعد اس خوابیدہ حسینہ پر گر کر ڈھیر ہو جائے۔ لیکن عین اس وقت فرحت نے کروٹ لی اور وہ گھبرا کر کیا اور پھر چپ چاپ اپنی چارپائی پر جالیٹا۔

نمامت یا ڈر

اگلے روز ایلی سارا دن اس کوشش میں لگا رہا کہ شہزاد کے رو بروندہ جائے۔ وہ شہزاد سے ڈرتا تھا۔ صح سویرے ہی اٹھ کروہ باہر نکل گیا اور کوٹلی جا کر قبرستان اور تالاب کے گرد بے مصرف گھومتا رہا۔ واپس آ کر چکپے سے اندر ہیری ڈیوڑھی سے گزر کر سیدھا فرحت کے گھر آ پہنچا حالانکہ حام طور پر وہ ہمیشہ شہزاد کے مکان سے گزر کر فرحت کی طرف آیا کرتا تھا۔ پھر جب وو پھر کو وہ گھر بیٹھا فرحت سے باقیں

کرنے میں منہمک تھا تو سیر ہیوں سے طبلے کی تھاپ سنائی دی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے بھول گیا کہ وہ کہہ کیا رہا تھا۔ کیا کہنا چاہتا تھا۔ فرحت اور ہاجره جیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ انٹھ بیٹھا ”اچھا میں ہو آؤں۔“ چشم سے شہزاد اس کے قریب آرکی۔ ایلی نے نکاہیں بھاگ لیں۔

”ایلی ہے۔“ شہزاد نے لاپرواںی سے کہا۔ ”نظر ہی نہیں آیا آج کہاں رہا۔“ وہ فہمی اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلی چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔

چوگان ویران پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پنچھے جو چوگان میں ہیل رہے تھے، مٹی کے پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ پرانی جو یعنی کی حمیدہ لال شین کر پر دونوں ہاتھوں کے اسے گھوڑا تھی۔ کیپ کی کھڑکی کی پیشائی دکھانی دے رہی تھی۔ کنوئیں کے پاس رہنے والی کشمیرن یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوکی پر زور دنگ کے گوشت کا ڈھیر لگا رکھا ہو۔

پھر وہ دادی اماں کے پاس جا بیٹھا۔ مگر وہ خاموش چارپائی پر پڑی تھی۔ ”تو آ گیا۔“ سیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”جا۔ جا کر کھیل۔“ یہاں نہ بیٹھے بیمار کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔ ”کچھ دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر گھبرا کر باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

شام کو جب وہ فرحت کے ساتھ شہزاد کے کوٹھے پر سونے کے لئے گیا تو اس نے جھلک جھلک آنکھوں سے محسوس کیا کہ شہزاد مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں نظر کی دھار تھی۔ نفرت بھری مسکراہٹ۔

”تو سمجھی یہیں ہے ایلی؟“ وہ بولی۔ ”میں سمجھی چلا گیا ہے واپس امر تسر۔“ ”نہیں تو۔“ شہزاد کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔ ”کیا ہوا ہے تجھے؟“ وہ بولی۔

چارپائی پر لیٹ گیا۔

مہر سکوت

اگلے روز وہ بہت دیر ہے بیدار ہوا۔ اس نے کوٹھے پر چاروں طرف دیکھا۔ فرحت جا چکی تھی۔ شہزادی کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ صرف صبیحہ پڑی سوراہی تھی۔ موقعہ کو غیمتِ جان کروہ جلدی سے اٹھاتا کہ شہزاد کے آنے سے پہلے ہی فرحت کی طرف چلا جائے۔ جب وہ روازے میں داخل ہوا تو کسی نے زور سے اس کی قمیض پکڑ لی۔ ”کہاں جاتا ہے تو آہڑھ چائے پی کر جانا۔“ شہزاد کو دیکھ کر اسے پہینہ آ گیا۔

”نہیں نہیں۔“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”اوہ رآ کربات کرنا۔“ وہ اسے گھیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھا کر خود بے نیازی سے میز پر چائے کے برتن رکھنے میں یوں مصروف ہو گئی جیسے ایلی سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو جیسے وہ اسے پکڑ کر لائی نہ ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”پی چائے۔“ وہ یوں گھوکر بولی جیسے بچے کو دوا پلا رہی ہو۔ ”پی سانپ سونگھ گیا ہے تجھے کیا۔“

”ہا۔“ وہ بولا۔ ”سانپ سونگھ گیا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ نہیں۔ ”پھر تو تو بڑا ڈھیٹ ہے کہ اب تک اچھا بھلا چلتا پھرتا ہے۔“

”لوگ نہ جیئے دیتے ہیں نہ مرنے۔“ وہ بولا۔

”اتنی پرواکرتا ہے تو لوگوں کی۔“

وہ لا جواب ہو گیا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”ایلی۔“ وہ بولی۔ ”وہ کیا حماقت تھی۔ مجھے تجھ سے ایسی توقع نہ

تحی۔ ایلی۔ ”اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تجھے شرم نہ آئی۔“

ایلی کی ناک پر پسینہ آگیا اس کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ ”اور پھر ایسی بات کرے تو ایلی۔“ وہ بولی ”کوئی اور کرتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔“

ایلی کے دل میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس میں ہمت نہ تھی پھر اس نے سوچا کہ پاؤں پر گز کر معانی مانگ لے لیکن پاؤں پر گرنا بھی تو مشکل تھا۔ اس نے شہزاد کے پاؤں کی طرف دیکھا کتنے خوبصورت تھے۔ جیسے سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہوں۔

شہزاد نے کروٹتی لی اور اس کا ایک بازو کرنی بھے پیچ لکھ لگا۔ ”مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔“ اس نے اپنی بات دہرا لی۔ اس نگینہ اگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی کی نگاہیں اور پر اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے کی زردی سرخی میں بدلتی گئی۔ وہ اٹھ کر شہزاد کی طرف لپکا اور اس کے لٹکتے بازو سے یوں پٹ گیا۔ جیسے کوئی نیوالا سانپ سے لڑ رہا ہو۔

اس نے شہزاد کو چپ کرنے کے لئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہ جانے کیا محسوس کر کے وہ شہزاد کے بالوں پاؤں سے پٹ کرانے ہونٹ ان پر ملنے لگا۔ ”شہزاد۔ شہزاد۔“ وہ گلگنایا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔“

لیکن ایلی دیوانہ اور اس کے پاؤں سے لپٹا رہا۔ آہستہ آہستہ شہزاد کی مدھم پڑتی گئی۔

”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے“ ایلی کی آواز بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ شہزاد نے بڑھ کر ایلی کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی۔ اس گٹھڑی کے پٹ از سر نوبند ہو گئے۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ مرگان نے ان سیاہ شراروں کو ڈھانپ لیا اور اس کے بازو فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔

ایلی نے جواب میں یہ بات صرف اس لئے کہی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی جواب دینا ممکن نہ تھا۔ معانی مانگ لینے کا امکان تو تھا۔ مگر اس میں اس کی بے عزتی تھی اگر وہ معانی مانگ لیتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ حرکت اس نے کسی نہ موم خیال سے کی تھی۔ سستی عیش و عشرت کے خیال سے یا انگلیں وقت کٹی کے لئے۔ اس کے علاوہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر معانی مانگ لی تو وہ شہزادے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ کس منہ سے اس کے رعایرو جایا کرے گا۔ بے شک اسے شہزادے بے پناہ دچپی تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔ مگر یہ مضطرب بے نام اور بے مقصد تھا۔ اس نے بھی شعوری طور پر شہزادے محبت کرنے کی آرزو محسوس نہ کی تھی۔ نہ ہی اس نے بھی سوچا تھا کہ شہزادے وہ اس قسم کا تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ اللاد و اللاد اس قدر باند اور عظیم، سستی سمجھتا تھا کہ اس کے قرب کی آرزو دل میں رچانے کے خیال ہی سے گویا اس کی جان لٹکتی تھی۔

اگر اس میاںی چاندنی میں وہ تنہائی میں اس کے قریب نہ ٹھیکی یا اس کے ہاتھوں پڑھائی رنگ نہ ہوتا یا حتا میں وہ بونہ ہوتی جو ایلی کو مشتعل کر دیا کرتی تھی یا وہ ہاتھ از راہ اتفاق ناگ کی طرح پھن نہ اٹھاتا اور ایلی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اسے اپنی حفاظت کرنی ہے تو وہ کبھی شہزاد کو اپنی گرفت میں نہ لیتا۔

اگر شہزاد بار بار سے نہ بلا تی تو اس کی گردن جھکی ہی رہتی اور آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا یا اگر شہزاد تنہائی میں اس سے اس کے احتمانہ رو یہ کے متعلق استفسار کر کے اسے لا جواب نہ کر دیتی تو وہ اپنی گزشتہ حماقت کا اعادہ نہ کرتا اور اس کی زندگی میں شہزاد کارنگلیں بخنوپ پیدا ہی نہ ہوتا اور اس کی داستان حیات سراسر مختلف ہوتی۔

ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات نے مل کر ایلی کی زندگی کے دھارے کارخ پھیر دیا۔

ذوبتے کی طرح ایلی کے لئے وہ رنگین ہاتھ تکا بن گئے اور وہ ان رنگین ناگوں سے دیوانہ وار چھٹ گیا ان ہاتھوں سے چمنے کے لئے صرف ایک جواز ہو سکتا تھا۔ صرف ایک ”مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔“ اپنی لغزش پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اس جملے کو دیراتا گیا تھی کہ وہ کمر و وہ مکان اس کے اس جملے سے گوئی بخوبی لے گے۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔“ نہ جانے اس الفاظ نے یا اس بڑھتی ہوئی شدت نے جس نے وہ ادا کئے جاتے تھے یا ان کی ادائیگی کے قوا ترنے شہزاد کی عقل و خرد کو مغلوب کر دیا یا ممکن ہے کہ اس میں قوتِ دماغ باقی نہ رہی ہو۔ ممکن ہے شہزاد ان الفاظ کی بھوکی ہو اور شریف نے ہمیشہ اسے اس جملے سے محروم رکھا ہو۔ اس لئے شہزاد نے انجانے میں ایلی کو وہ الفاظ لے گئے پر مجبوڑ کر دیا ہو۔ شاید شہزاد اپنے خاوند کے رویے سے اکتا چکلی ہو، جو ہر وقت نکلی لگائے چھت کی طرف دیکھا رہتا تھا۔ جو کبھر تکی آنکھیں بنا کر لیتا رہتا تھا جو ہر بات پر آہ بھرتا تھا اور انور کی محبت کے خود ساختہ فریب میں ڈکیاں لینے میں لذت محسوس کرتا تھا اور شہزاد اس کے قریب اس بات کی تمنا میں گھلتی رہتی تھی کہ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھے۔ ایک بار ماضی کے دھند کے سے نکل کر حال کی طرف متوجہ ہو۔ ممکن ہے کہ شہزاد شریف کی پچھی محبت کے اکتا دینے والے تسلسل سے بیزار ہو گئی ہو اور اس کے دل میں یا آرزو ان جانے میں بیدار ہو چکی ہو کہ وہ بھی کسی کی انور بن جائے۔ بہر صورت اس کی کوئی بھی وجہ ہو نتیجہ یہ ہوا کہ شہزاد کو فریب دینے کے بعد ایلی نے ان جانے میں اپنے آپ کو فریب دینا شروع کر دیا اس نے حقائق کو اپنے خود ساختہ جذبات کے ایندھن میں جلا جلا کر سرخ کر لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اسے شہزاد سے محبت ہے۔

گودی کا گیند

اس روز وہ سارا دن شہزاد کے قدموں میں بیٹھا رہتا رہا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں نے بار بار چاہا کہ اظہار محبت نہ کروں۔ تمہیں

ناراض نہ کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گی اور تم ناراض ہو جاؤ تو پھر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ شہزاد تم ناراض تو نہیں۔ شہزاد۔ بولو تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہارے قابل نہیں شہزاد میں تمہارے قریب آ جاؤں تو تم میلی ہو جاتی ہو۔ تم چاند ہو شہزاد اور میں بے وقوف بچھے میں تمہارے قابل کہاں۔ مجھے برداشت کرو گی شہزاد۔ بولو شہزاد۔“

شہزاد حیرانی نے اس کی باتیں سنتی رہی۔ ابتدا میں تو اس کی حیرانی میں بیگانگی کا غصر غالب تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ بے شکی باتیں وہ احتمان ہوتی۔ وہ بے مصرف پکلا پن جو ایلی کی باتوں اور پھرے سے ہو یہاں تھا اس کے دل پر نہ جانے کیا اثر پیدا کر گیا۔ ایلی کی بے شکی باتیں اس کے کافوں سے داخل ہو کر پھرے پر نگانے لگیں گالوں پر سرخی بن کر جھلنکے لگیں آنکھوں سے پرم صستی بن کر جھانکنے لگیں۔

”تم میری حمایت کسی کو بتاؤ گی تو نہیں شہزاد۔ میری دیوانگی اپنے تک محدود رکھو گی نا۔ وعدہ کرو شہزاد، اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو میرا کیا ہو گا۔ پھر میں اس گھر میں کیسے آ سکوں گا اور..... تم سے دور رہ کر زندگی کیسے کئے گی۔ شہزاد غصہ نہ کرنا۔ میں مجبور ہوں شہزاد۔“

شہزاد کے چہرے پر حیا کی سرخی جھلنکنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھکنے لگیں۔ اس کی ناک پر پینہ آنے لگا اور پھر اس کے بازو بے جان ہو کر لٹکنے لگے جیسے سپردگی کے شدید جذبے سے شل ہو چکے ہوں۔

مگر ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ اس کے منہ پر حیا کیوں جھلک رہی ہے۔ اس کی ناک پر پینہ کیوں موتیوں کی طرح ابھرتا آ رہا ہے اور اس کے بازو لٹک کیوں رہے ہیں۔ وہ ابھی تک زینے کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم جمانے کی جدوجہد میں دیوانہ وار مصروف تھا۔

”تم بتاؤ گی تو نہیں شہزاد..... تم مجھے معاف کر سکو گی۔ میں تمہیں دوسرے

دیکھا کروں گا۔ دوسرے بس۔ اتنا تو تم برداشت کر لوگی۔ نا۔“

ایلی عورت سے واقف نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی بے تکلی باتوں نے شہزادو کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ تمام کا تمام زینہ گر کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہے اور پہلی سیر ہی پر قدم جلانے کی کوشش میں کھوئے رہنا پیکار ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ وہ لٹکتے ہوئے رنگین ناگ اس کی الگ گرفت کے لئے منتظر تھے۔ بے تاب تھے اور وہ ڈولتی ہوئی پر نم شربتی آنکھیں اس ناظار میں کھلی ہوئی تھیں کہ کوئی لمس نہیں بند کر کے راحت بھرا سکوں بخش دے اور وہ رنگین گلشنگ گھڑی جو ہر لمحہ بند ہوئی جا رہی تھی اس بات کی خواہش مند تھی کہ کوئی اسے آٹھا کر گودی کا گیند بنا لے۔

اسے ان باتوں کا احساس بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارہ عورت اور محبت کی دنیا کی دلیز سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کا مقصد تو صرف اس قدر تھا کہ کسی شے کسی طرح اپنے آپ کو بچالے اپنی حماقت کو شرنہ ہونے دے اپنے خود ساختہ راز کو محفوظ کر لے۔

عین اس وقت اگر ہاجرہ نہ آ جاتی تو نہ جانے وہ دونوں کب تک یوں ہی بیٹھے رہتے۔ ہاجرہ کے پاؤں کی چاپ سن کر اس منتظر موگنیا گلشنگ گھڑی کا ٹلسما ثوٹ گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ کر بیٹھی۔

”اچھا تو چائے۔ بناؤں تیرے لئے۔“ وہ ابوی۔

”چائے۔“ وہ گھبرا گیا۔ چائے کی تو بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔“ شہزاد ابوی۔ ”اب تو چائے پی کر رہی جانا۔“

ہاجرہ کے آنے پر شہزاد کا انداز ہی بدلتا گیا وہ یوں نہ کر اس سے باتمیں کرنے لگی جیسے کوئی بچی انتہائے معصومیت میں اظہار مسرت کرتی ہے۔ ایلی چکپے سے اٹھ بیٹھا اور مکن بتائے چوری سے باہر نکل گیا تاکہ کوئی اسے روک نہ لے۔ جوں جوں وہ شہزاد کے چوبارے سے دوڑ رہتا گیا تو اس کے دل میں از سرنویہ ڈر

پیدا ہوتا گیا کہ شہزادا مس کو وہ بات نہ بتاوے شکایت نہ کر دے۔ اگر اس نے شریف سے کہہ دیا تو نہ جانے اس نے اسے معاف بھی کیا ہے کہ نہیں۔

فرار

باہر جا کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس امر تر چلا جائے گا تاکہ پھر شہزاد کے سامنے جانے کا خدشہ نہ رہے۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں اکٹھی کیں اور پھر سوت کیس اٹھا کر باہر نکلا۔ صحن میں فرحت ہندیا پکاری تھی۔ ”میں جا رہا ہوں فرحت۔“ وہ بولا۔

”جا رہا ہے تو کیا واقعی جا رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”کہاں جا رہا ہے تو؟.....“
ہائی۔ اتنی جلدی۔“ وہ حیران رہ گئی۔ ”تمہیں واہی چاروں اور رہنا تھا۔“
”نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی۔“ میں بولا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ فرحت نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے کیا؟“

”اوہ ہوں۔“

”نه جانے تو ہم سے کیوں ناراض رہتا ہے۔ ایلی۔ ہمارا کیا قصور ہے؟“

”نہیں تو۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”تو کیا شہزاد نے کہا ہے کچھ؟“

”میں کہتا ہوں۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا مجھے۔“

”تو میں شہزاد کو بلاوں۔ وہی تمہیں روک سکتی ہے۔“ فرحت نے مغلصانہ طور پر کہا۔

”نہیں نہیں۔“ شہزاد کا نام سن کر وہ ڈر گیا۔ ”مجھے امر تر سے خط آیا ہے۔“

”خط آیا؟“

”ہاں میرا دوست بیکار ہے۔“

”اوہ۔“ اس نے اطمینان کا سنس لیا۔ ”تو پہلے کہا ہوتا مجھ سے۔“

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“

”لیکن اماں سے تو مل کر جاؤ اور تیرتی بادی اماں۔ وہ بھی تو بیمار ہے اس کی
حالت۔“

یہ کہہ کرو وہ چکے سے میرھیاں اترنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ راستے میں اس کا کوئی دوست نہ مل جائے۔ اگر رضامیں گیا تو غصب ہو جائے گا وہ اسے شک کرے گا۔ لیکن خوش فہمتی سے چوگان میں بجھوں کے سوا کوئی نہ تھا اور رضا سے پختے کے لئے وہ ایک اور راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

ریل میں بیٹھے ہوئے وہ پچھی پھٹی نکاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس روز دنیا ہی بدلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سبزہ گویا نئے انداز سے لہر ارہا تھا۔ بوڑھے عجیب شان سے کھڑے تھے۔ پھول بہت ہی شوخ تھے۔ جیسے رنگیں دیئے گئے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان انوکھی رومان بھری فضا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑی یوں چلی جا رہی تھی جیسے مور چھاتی پھلا کر پرواز کر رہا ہو۔ ایسا جی چاہتا تھا کہ مناظر کے حسن یہ رو دے۔

امر تر پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی نئے شہر میں آپنچا ہو، جسے اس نے سپنے میں دیکھا ہو۔ سٹیشن کے گنبد الاف لیلے کے کسی پر اسرار منظر کی یاد دلار ہے تھے۔ سڑکیں خوشی سے ادھرا دھر دوڑ رہی تھیں لوگ آر ہے تھے۔ جیسے کسی تقریب پر اکٹھے اور ہے ہوں۔

لیکن بورڈنگ میں وہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رامو بیٹھا برتن صاف کر رہا تھا۔
بندوآٹے کی بوریوں میں سردیتے بیٹھا تھا۔ ہر نام سنگھ، گورچن سنگھ اور جیون ایک
درخت کے نیچے بیٹھے اپنے کیس سکھار ہے تھے۔ کمرے میں اللہ دا وکری پر اپنی قمیض

پھیلائے خوفزش پر بیٹھا سر پر آم کی خشک گٹھلی رگڑ رہا تھا۔

”ارے۔“ اللہ دادا سے دیکھ کر چلا یا۔ ”تو آگیا۔ بیٹا چار روز پہلے ہی ماں کی گود چھوڑ آیا تو۔ اونہوں بیہاں تیرا جی نہ لگے گا۔“

”بک نہیں۔“ ایلی نے بناولی غصے سے کہا۔
”اچھا بھئی۔“ اللہ داد چلا یا۔ ”ایک تم ہو کہ ماں کی گوئیں چھوڑتے ایک وہ شفیع ہے۔ جو سارا سارا دن یوں سانپ مارتے ہیں لگا رہتا ہے۔ جیسے کانج میں سانپ مارنا سیکھنے کے لئے داخل ہو۔ بس ایک میں رہ گیا ہوں۔ محنت کرنے کے لئے۔“ یہ کہہ کر اس نے مظلومانہ اندازو سے سر پر آم کی گٹھلی رگڑ نی شروع کر دی جیسے امتحان پاس کرنے کے لئے سر پر آم کی گٹھلی رکڑ نالا زام ہو۔

ایلی دھم سے چارپائی پر گرپڑا۔ اسے اللہ داد کی باتوں سے کوئی لچکی نہ تھی نہ جانے کیا ہوا تھا اسے، دغدعاً اسے اس بورڈنگ، کانج اور شہر سے کوئی لچکی نہ رہی تھی۔ وہ کمرہ بیگانہ محسوس ہو رہا تھا اور اللہ داد یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی ہو۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ گٹھلی رگڑتے رگڑتے اللہ داد نے ایک نظر ایلی کی طرف ڈالی اور پھر چپکے سے بولا۔ ”ارے بھائی پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ایلی بابو ماں کی گود کے لئے بتاب رہتا ہے۔ اس لئے بار بار گھر کو بھاگتا ہے۔“ یہ کہہ کرو وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر آپ ہی آپ بولا۔ ”لیکن آخر وہ بھی تو گود ہے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔“ اللہ داد نے لمبی آہ بھری۔ ”وہ بھاگاں بھری تھی اپنی۔ اللہ جانتا ہے اس کی گود میں پڑ کر مجھے بے بے بھول جاتی تھی۔“ ایلی یہ سن کر بھونچ کارہ گیا اس کم بخت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ..... اسے غصہ آنے لگا۔ لیکن وہ کرہی کیا سکتا تھا اور اللہ داد کی معصوم مسکراہٹ کے جواب میں غصہ کرنا بالکل ہی بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا نہر کے کنارے پر جا پہنچا دراصل اس کا جی چاہتا تھا کہ اچانک نور سے ملاقات ہو جائے اور پھر شبح لگن آ

جائے۔ اس کے دل کے نچلے پر دوں میں ایک شیخگان جھلک رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ دل کی گہرائیوں سے نکل کر وہ اس پر مسلط و محیط ہو جائے اور پھر وہ اپنے دوں کی اوٹ میں بیٹھ کر چپکے روئے۔ آنسو اس کے گالوں پر ڈھکلیں اور نور پوچھے۔ ”کیا ہے جی۔“ جیسے اس کی عادت تھی اور وہ جواب دے۔ ”کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“

”ہائیں۔“ غیر کے کنارے آصف کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اس کی آنکھوں میں وہی پھوکار پڑ رہی تھی لیکن یہ ظاہرنہ ہوتا تھا کہ آیا وہ خوشی سے سرخ ہو رہی ہیں یا غم کی وجہ سے۔ ”آج کی دنیا دبی دبی مسکراہٹ سے کہا۔“
”آگئے تم.....“ اس نے دبی دبی مسکراہٹ سے کہا۔
”ہا۔“ ایلی نے آہ بھری۔ ”تم یہاں کیا گر رہے ہو۔ نور کا انتظار کر رہے ہو کیا؟“

”اوہہوں۔“ آصف نے لفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”سیر کرنے آئے تھے۔“

”سیر.....“ آصف نے زہر خندے سے کہا۔ ”میں کہاں جاؤں ایلی۔“

”کیوں۔“ ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

”کوئی جگہ بھی تو نہیں رہی۔“

”کیوں۔“ ایلی چلایا۔

ولیں نکالا

”وہ..... وہ واپس آگئی ہے۔“ آصف نے آہ بھر کر کہا۔

”واپس آگئی ہے۔“

”ہا۔“ وہ بولا۔ ”جیسے انتقام لینے آئی ہو۔“

”انتقام۔“ ایلی نے دہرا یا۔

”اب وہ کسی کا لاحاظ نہیں کرتی اور ایلی اب تو وہ اعلانیہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے
گھروالے بیچارے ہار گئے ہیں۔ محلے میں کہرام مچا ہوا ہے اور میں گھر سے بھاگا
پھرتا ہوں۔ اب ہو گا کیا ایلی۔ کیا کروں میں۔“

ایلی کی سمجھ میں ٹیکیں آتا تھا کہ اس میں مشکل کون سی تھی۔ یہ تو بلکہ اس
کی خوش قصیبی تھی۔ عجیب آدمی تھا آصف بھی۔

”دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے۔
”دیکھتی ہے تو دیکھنے وو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اتھی رسولی اتنی بد نامی ہو رہی ہے کہ آصف نے جھر جھری لی۔“ میرا تماشا
بنار کھا ہے اس کے گھروالے کھلتے ہیں ہم کیا لڑائیں۔ لڑکی ہوش و حواس کھو چکی ہے
اور اگر اس پر.....“ وہ خاموش ہو گیا اور پھر حسرت و یاس بھری نگاہ سے اس نے
ایلی کی طرف دیکھا۔

”میری طرف محلے والے یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی مجرم ہو۔ جیسے اس کی دیوانگی
میری وجہ سے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کر آزاد ہو گئی ایلی مجھ سے تو وہی اچھی ہے۔ لیکن میں
کیا کروں میرا اپنے گھر میں آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ مجھے تو دیس نکالا مل گیا ہے۔“

”اچھا۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

”اگر تم کہو تو میں تمہاری بورڈنگ میں آ رہوں۔“ آصف نے پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“

”تو میں کل آ جاؤں۔“ آصف کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ ایلی کا سہارا
پا کر خوش ہو گیا ہو۔

”آ جاؤ۔“ ایلی خوشی سے چلایا۔ ”کتنا اچھا رہے گا۔ ہم صبح و شام اکٹھے رہیں
گے۔“ ”سچ۔“ آصف نے اس کا ہاتھ دیا اور نہ جانے کب تک وہ اسی طرح ہاتھ
پکڑے نہر کے کنارے بیٹھے رہے۔ آصف اپنے خیالات میں مگن تھا مگر ایلی کے

روبر و کچھ اور ہی تھا ایک گورا گورا بازوں کی طرف بڑھتا اور حنامالیدہ ہاتھ سے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ”ایلی تم لوگوں کی پرواکرتے ہو؟“ دو گلابی آنکھیں اس کی طرف دیکھتیں، گال بھری پچکاری چلتی اور اسے شرابو کر جاتی۔ وہ ایک نگاہ کس قدر مدھوش کن تھی۔ ایک نگاہ۔ اس نگاہ کو حاصل کرنے کے لئے ایلی دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ آصف سے وہ راز کہہ دے کسی سے کہہ دے اور اپنے آپ کو محفوظ کر لے مگر وہ شہزاد کار از تھا وہ اسے کس طرح افشا کر سکتا تھا اور پھر آصف سے وہ راز کہنا جو اس غم میں گسل رہتا تھا کہ ایک حیثیت اس کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ بھلا شہزاد کی مست کن نگاہ کو آصف کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ایلی بات کہتے کہتے کہتے رک جاتا اور پھر آسمان پر پھیلی ہوئی سرخی کو دیکھنے میں کھوجاتا اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شہزاد کے گالوں سے اتر کر وہ سرخی آسمان پر پھیل گئی ہوا اور اس کا ہر چھوٹ سے چھوٹا دھبہ کہہ رہا ہو۔ ”تم لوگوں کی پرواکرتے ہو۔ تم ایلی۔“ اگلے روز صبح سوریے وہ دونوں پر پسل کے گھر پلے گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ آصف کو ایک ماہ کے لئے بورڈنگ میں رہنے کی اجازت دے دے۔

پرپسل نے ان کی بات سن کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”آصف کیا بات ہے۔“ وہ مسکرا یا۔

”بات تو کوئی نہیں پرپسل صاحب۔“ آصف کے چہرے پر گھبراہٹ کا طوفان آ گیا جو اس کی بات کو اعلانیہ جھٹکار رہا تھا۔ پرپسل مسکرانے لگا۔ ”بھی ایک بات کرو۔ زبان سے کہہ رہے ہو کہ کچھ نہیں اور نگاہ ہیں کہہ رہی ہیں بہت کچھ ہے۔“ ایلی نے گھبرا کر سچی بات کہہ دینے کی غرض سے منہ کھولا۔ ”جی بات یہ ہے۔“ وہ بولا۔ آصف نے بھر پور نگاہ ایلی پر ڈالی اس نگاہ میں ایک طوفان تھا۔ غصہ تھا۔ بے سی تھی۔ منت تھی۔ دھمکی تھی۔ ایلی سہم کر خاموش ہو گیا۔

پرنسپل نے ان دونوں کی طرف تعجب سے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ نہ سمجھ سکا۔ ”پڑھائی کا بہانہ نہ کرنا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے تو بہتر ہے کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ اس کی وجہ بتانے سے ہم قاصر ہیں۔ بہر صورت مجھے یقین ہے کہ تم شہزادے کے درپے نہیں ہو اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو گی جو کانج کے لئے باعث بدنامی ہو۔“

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہ ہو گی۔“ آصف بولا۔

”اچھا تو اجازت ہے۔“ پرنسپل نے کہا۔ ”اب تم جاؤ اور آرام کرو مجھے صورت حال اچھی نہیں دیکھنی الگ تم مجھے دوست سمجھ رہتا تھا تو شاید میں مدد کر سکتا۔ لیکن خیر۔.....“

جب وہ بورڈنگ میں پہنچا تو لڑکوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ ”ایلی، ایلی۔

ارے تیرا نثار آیا ہے۔“

داؤگی اماں

”اے جا کر پتہ بھی لگائے گا کہ نہیں۔“ شفیع چلانے لگا۔

”اللہ وادیولا۔“ بھی تار والا ادھر ہی تو گپا ہے تمہیں دیکھنے کے لئے،“

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چپکے سے بھاگ جائے۔ جہاں تارو والا سے تلاش نہ کر سکتے تاکہ وہ اس خفت سے بچ جائے مگر اسے تارو الے کی تلاش کرنا ہی پڑی۔ اللہ داد کیا کہے گا۔ لڑکے کیا سمجھیں گے اس کے باوجود وہ دعا کیں مانگ رہا تھا کہ تارو والا جا

چکا ہو۔

تاروں لے کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اسے یوں بت بنے دیکھ کر اللہ داد نے تار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تار کھولنے ہوئے بولا۔ ”ماں اپنے لاڑکانے کی فرقت میں اداس ہو گئی ہو گی۔“ وغایا اللہ داد خاموش ہو گیا۔ اس کی انگلیاں افطراب سے تار کو پھر تہہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ”بے شفقت نے اس سے اپنے چھٹے کے لئے کچھ کہنا چاہیا۔“ مگر اللہ داد کا چہرہ دیکھ کر اس میں ہمت نہ پڑی۔ وہ یہ تک برآمدے میں خاموشی چھانی رہی۔ پھر آصف آہستہ سے بولا۔ ”ایں تمہاری دادی اماں.....“

”دادی اماں۔“ ایں یہ میرانی سے دہرایا۔

”ہاں۔ تمہاری دادی اماں چلی گئیں۔“ آصف نے کہا۔

”چلی گئیں؟.....“ ایں نے گھبرا کر تار کی طرف دیکھا اس کے منہ سے ایک بیکھری نکلی اور پھر دور سے آواز آئی۔ ”نہیں ایں۔ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“ جب وہ محلے کے چوگان میں پہنچا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ چوگان کے عین درمیان میں جنازہ پڑا تھا۔ چاروں طرف محلے والے کھڑے تھے۔ محلے والیاں پنکھے چلاتے ہوئے کچھ کچھ برا تینیں کر رہی تھیں۔ محلے والے جنازے کے متعلق یوں تفصیلات طے کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عام تقریب ہو۔ جس میں غم یا دکھ کا کوئی غصر نہ ہو۔

”ایں کو دیکھ کر کوئی چلائی۔“ اے ہٹ کے کوتاؤ آ لینے دو اپنی دادی کے قریب۔“

”ہائیں آ گیا تو ایں۔ شکر ہے آ گیا تو۔“

”ہائے بہن اس کے بغیر تو دم نکلتا تھا اس کی دادی اماں کا۔“

”اس کے سوا اور تھا ہی کون اس کا۔ علی احمد نے تو کبھی پوچھا ہی نہیں۔“

”آخر دم تک یا دکرتی رہی تھے۔ لے دیکھ لے اس کا منہ۔“

ایلی دادی اماں کی طرف دیکھنے سے ڈر رہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مری ہوئی دادی کی طرف دیکھے۔ نہیں نہیں وہ جیتی ہے مری نہیں۔ اس کے تختیں میں وہ ابھی تک جیتی تھی۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی ایلی نے نگاہ پھیر لی اور دادی اماں کی طرف دیکھے بغیر ہی وہاں کھڑا رہا۔

چاروں طرف لوگوں کا جھمکھا لگا ہوا تھا ہر کوئی دوسرے سے بات کر رہا تھا۔ ان کی باتوں پر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ کیا انہیں دادی اماں کی موت کام نہیں۔ کیا انہیں ان کی موت پر کہنیں ہوا یونہ شوٹی سے ایک دوسرے سے باتیں کیوں کر رہے تھے۔ نگاہ ایلی کی نگاہ علیٰ احمد پر پڑی۔ وہ چپ چاپ بٹ بنے کھڑے تھے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ دکھ محسوس کر رہے ہوں۔ پہلی مرتبہ ایلی کو خیال آیا کہ ان کے دل میں بھی جذبات ہیں۔ انہیں بھی کسی کے مرنے پر دکھ ہوتا ہے۔ انہیں بھی عزیزوں کے دکھ سکھ کر احساس ہے۔ یہ احساس ایلی کے لئے بالکل نیا تھا اور اتنا عجیب تھا کہ اس نے جلد ہی اس سے مخلصی پانے کی کوشش کی۔ پھر چار بزرگوں نے بڑھ کر جنازے کو اٹھالیا اور وہ سب ان کے پیچے پیچھے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

علی پور کے بازار میں جنازے کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے لوگ رک جاتے تھے۔ دو کامدار سودا سلف تو لنا چھوڑ کر ایک طرف ادب سے کھڑے ہو جاتے گا بہ بازار سے ہٹ کر کسی بند دوکان کے تختے پر چڑھ جاتے۔ کھیلتے ہوئے پچ سہم کر رک جاتے اور منہ میں انگلیاں ڈال کر حیرانی سے اس جلوس کی طرف دیکھتے۔

بازار سے نکل کر وہ کھیتوں میں جا پہنچ۔ کھیتوں پر کام کرنے والے کسان انہیں دیکھ کر کام چھوڑ کر ان کے ساتھ چل پڑے۔

”کیوں بھائی کس کا جنازہ ہے۔“

”مائی کس کی والدہ تھی۔“

”اچھا وہ جو فنٹر کے بابو ہیں۔“

”آیا کرتے ہیں کبھی اس طرف۔“

”کیا تکلیف تھی۔“

”جی ہاں۔ وہ تو بہانے ہوتے ہیں۔ اصل میں تو اقدار کا لکھا ہوتا ہے جو ہو کر رہتا ہے۔“

جنازے کے آگے محلے کے بوڑھے آخ ٹھوکوتے کھانتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کھاننے کے علاوہ مدمم آوازیں چلاتے ”یا رب العزت یا اللہ۔“ ” قادر مطلق“ ان سے پچھے پچھے محلے کے جوان تھے اور سب سے آخر میں محلے کے نوجوان جو چلتے ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے، چکلیاں بھرتے تھے، پھر یوں سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے۔ جیسے وہ الیکٹریک حرکت کے اہل ہی نہ ہوں۔ کبھی کبھار نوجوانوں کی قطاروں سے دبے دبے تھے بلند ہوتے جس پر محلے کے بوڑھے آخ کہہ کر رک جاتے اور ٹھوکرنے کی بجائے غضب آلو دنگا ہوں سے پچھے کی طرف دیکھتے۔

لیکن اس روز ایلی سب سے پہلی قطار میں چل رہا تھا اسے احساس نہ تھا کہ بوڑھے مٹھاکہ خیز انداز میں آخ ٹھو آخ ٹھو کر رہے ہیں یا جوان دزدیدہ نظروں سے کھیتوں میں بنے ہوئے گھروندوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ فام مگر نوجوان اڑکیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں یا نوجوان کہنیاں مار مار کر ایک دوسرے کو کسی قابل توجہ مظر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اس روز ایلی کا ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس پر ایک پریشان کن تعطل مسلط اور محیط تھا۔ نہ گھبراہٹ تھی نہ پریشانی نہ خوشی تھی نہ غم۔ اس کی سمجھتے میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ دادی اماں کی موت کا

مفہوم کیا ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ وہ چپے جارہا

تحا خاموش بے حس!

وہ مرگی

جنازے کی نماز کے بعد قبرستان میں دیریکٹ وہ اس جگہ بیٹھا رہا جہاں کھڑے ہو کر اس نے نماز پڑھی تھی اور جہاں پاس ہی چادر سے ڈھکی ہوئی چار پالی پر دادی اماں پڑھیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے اللہ سے بڑی بخوبی دعا میں مانگی تھیں۔ ”یا اللہ یہ کیا ہو گلیا یا اللہ دادی اماں اب مجھ سے کبھی نہیں گی۔ یا اللہ۔“ اس نے بن سوچے تھے یہ سب دعا میں مانگی تھیں لامسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ دعا میں مانگ رہا ہے یا وہ دعا میں نہ تھیں بلکہ سوالات تھے۔ عجیب سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ دعا میں مانگ کروہ وہیں بیٹھ کر زمین کریدتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسے اس مقام سے وحشت ہونے لگی۔ وور لوگ قبر کھونے میں مصروف تھے۔ قبرستان میں یہاں وہاں محلے والے لوگوں میں بیٹھے ہوئے دلبی دلبی آوازوں میں باقی کر رہے تھے۔ جوان دور پختہ تالاب کی طرف نکل گئے تھے اور نوجوان نہ جانے کہاں تھے۔

وہ اٹھ بیٹھا اور پھرتا پھرتا ان کچی قبروں میں جا پہنچا جہاں محلے کے عام آدمی دفنائے جاتے تھے۔ وہ گھبرا کر رک گیا۔ سامنے صدر ایک پیڑ کے نیچے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ اپنی ہی دھن میں بیٹھا کیا سوچ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک نہ تھی۔ بازو لٹک رہے تھے اور ہونٹوں پر کوئی بول نہ تھا۔

”تم ایسی۔“ وہ اسے دیکھ کر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”آؤ آؤ۔ تالاب کی طرف چلیں۔ آؤ۔ ابھی قبر میں اتارنے میں دیر ہے۔ آؤ۔“ اس کی آواز روئی تھی۔ وہ دونوں چپ چاپ تالاب کی طرف چل پڑے۔ ”تم آگئے.....“ وہ بولا تم تو چلے گئے تھے ناچھا کیا آگئے۔ ”وہ بولا۔“ بہت اچھا کیا۔ میں بھی جارہا تھا مگر

نہ گیا۔ محض اتفاق ہے ورنہ چلا جاتا۔ ”اس کا گلا خشک ہو گیا۔

دیر تک صدر خاموش رہا۔ پھر زیر لب بولا۔ ”مر گئی.....“ اور چپ ہو گیا جیسے گلا آواز سے خالی ہو۔ پھر دفتر اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے مٹی کا ایک ڈھینا اٹھا کر دور پھینک دیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو حافظہ خدا تمہارا جیسے دادی اماں پارسی اڑکی ہو اور اس کے چلے جانے پر صدر کا گلا آواز سے خالی رہ گیا ہو۔

”تم کہتے تھے وہ مرتی بھی نہیں۔“ ایلی نے گلوکیر آوازیں کہا۔

”ہاں۔“ صدر بولا۔ ”کہتا تھا۔ مگر وہ مر گئی۔ مر گئی۔“

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صدر کا وہ ایک لفظ دامتہ ان کو چھپائے ہوئے ہوئے ہو۔

”ہاں مر گئی۔“ ایلی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آگئے مگر صدر صدر کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ ایلی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آگئے مگر صدر اپنی ہی دھن میں لگنائے چلا جا رہا تھا اور ہر دس قدم کے بعد چپکے سے کہتا ”مر گئی۔“

بھی انک ادا سی

دادی اماں کو دفاتر سے فارغ ہو کر وہ محلے میں واپس پہنچ چوگان میں چاروں طرف کھڑکیوں اور منڈریوں پر عورتیں کھڑی تھیں اسے علم نہ تھا کہ شہزاد بھی وہیں کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ دوپٹے میں ستارے چمک رہے ہیں بازو دوپٹے سے الجھے ہوئے ہیں۔ لمبی تر چھپی آنکھوں پر مژگاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اسے شہزاد کے وجود کا ہی احساس نہ تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ اسے یاد ہی نہ تھا کہ شہزاد نے اس کے ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔

”ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہوا..... تم ایلی؟“

چوگان سے وہ ان جانے میں گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن میر صیاں چڑھتے ہوئے دفتر اس نے محسوس کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ گھر میں اب

کیا دھرا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ تخت ویران پڑا ہوگا۔ چوہبے کے پاس گھنٹوں میں سر دیئے کوئی بیٹھانے ہوگا۔ کوئی اس سے نہیں کہے گا۔

”تو آ گیا۔ میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ ہندیا میں۔“

کوئی نہیں چھے گا۔ ” ہے تو نے تو میری ہندیاں توڑ دیں۔“

کسی کا جھر یوں بھر اتا تھا سے تھکے گا نہیں۔ ” کچھ بھی تو نہیں ایلی۔“ وہ رک گیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

” دادی اماں۔ دادی اماں۔“ وہ قبر پر بیٹھا رہا تھا۔ ” دادی اماں یہ کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا ہے یہ؟“ ایک بوزھا چھرہ اس کی طرف لوکی کر مسکرایا وہ بھلی دار بازو اس کی طرف بڑھے۔ ” کچھ نہیں ایلی۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ چاروں طرف بجیا نک ادا سی چھائی ہوئی تھی۔ قریب ہی کوئی کنوں ان لگڑاہ رہا تھا۔ دور چکی ہونک رہی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

تبرستان سے اٹھ کر ابھی اس نے چھڑا یک قدم اٹھائے تھے کہ رضا آ گیا۔ ” تم۔“ ایلی نے رضا کی طرف تعجب سے دیکھا۔

” چل۔“ ” رضا بولا۔“ تیرے ابا بلا رہے ہیں۔ ” وہ خاموشی سے ایلی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایلی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ گھر جائے لیکن وہ چپ چاپ رضا کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ” بیٹھ جاؤ ایلی۔ تم کہاں آوارہ گھوم رہے ہو۔ فضول۔۔۔۔۔ ایلی کی ماں۔“ انہوں نے ہاجرہ کو بلایا۔ ” اس کا بستر بچا دو یہاں۔ آج یہ یہیں رہے گا۔ ہمارے پاس۔۔۔۔۔“

ایلی تم۔ تم ایلی

اگلے روز صح سویرے ایلی چکے سے علی پور سے امر تر چلا آیا۔ نہ جانے اس کے لئے علی پور میں رہنا کیوں ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ علی پور سے چلا

جائے اس مکان سے دور بھاگ جائے اس کے لئے اس تخت کی طرف دیکھنا ممکن ہو چکا تھا جہاں دادی اماں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

وہ رات علی پور میں اس نے یوں کالی جیسے کانٹوں پر پڑا ہوا اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ دادی اماں فوت ہو چکی نہ ہے۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے تخت پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہو اور ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر چارپائی پر اس کے سر ہانے آ بیٹھے گی اور اپنے جملی دار باتوں سے اسے تخلکنے لگے گی۔ ”سو جا ایلی سو جا۔ پچھمی تو نہیں۔“

اس خیال پر ایلی کو خوف سامنے محسوس ہوتا کہ دادی مرضی پڑے اور اب وہ بھی آ کر اس تخت پر نماز نہیں پڑھ سکے گی۔ اسی بناء نام ذرا کی وجہ سے اب کی بار علی پور میں رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ ملی ایسی وجہ اسی وجہ سے سیدہ حضرت کے پاس بیٹھی قرآن کریم پڑھ رہی تھی۔

”خالہ۔“ اس نے سیدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

”کہاں جا رہا ہے تو۔“ سیدہ نے سرسری طور پر پوچھا۔ ”جا رہا ہوں۔“ اس نے سر کی جنبش سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہاں جائے گا تو اس وقت۔“ سیدہ چڑھ گئی۔

”امر تر،“ وہ بولا جیسے امر ترا اس مکان کے کسی کمرے کا نام ہو۔

”امر تر؟“ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے جانا ہی چاہیے۔“

”ابا سے تو پوچھ لے۔“ وہ چھپھلا کر بولی۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں۔“

”نہیں نہیں یہ مناسب نہیں۔“ وہ بولی۔ ”بڑوں سے بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔“

ایلی نے گویا سیدہ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

سیدہ نے شور مچایا۔ ”ایلی امر تر جا رہا ہے میں کہتی ہوں سن آپ نے ایلی جا رہا

ہے۔“ اور سیدہ اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

علیٰ احمد کی آواز سن کروہ رک گیا اور اسے ان کے روپ و حاضر ہونا پڑا۔

”مجھے امتحان کے لئے تیاری کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے جانا ہی چاہئے۔“

یہ بات سن کر علیٰ احمد خاموش ہو گئے۔

”یہ تو بلکہ اچھا ہی ہے۔“ سیدہ بولی۔ ”پڑھائی میں لگ جائے گا۔“

گاؤں میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کا بو جھاڑتے گیا ہو۔ وہ خلا جو اس پر مسلط اور محیط تھا اب ختم ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اب غم بوند بوند اس کے بند بند میں سراست کر رہا تھا۔

ایلی کی نفیاں کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ کسی تکلیف وہ واقعہ پر اس کے دل کو غم کا دھپکا نہیں لگاتا تھا بلکہ ایسے واقعہ کی خبر سن کر اس کے ذہن میں ایک خلابیدا ہو جاتا جو اس کے تخلیل اور احساسات کو شل کر دیتا۔ دریتک اس پر یہ کیفیت طاری رہتی۔ جیسے وہ عالمِ خواب میں گھوم پھر رہا ہو۔ پھر بوند بوند غم اس کے دل میں سراست کرتا۔ اداسی چاروں طرف سے یورش کرتی۔

گاؤں میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے ساری دنیا ایک بے معنی پھیلا ہو جا چاروں طرف سے اداسی المدی آ رہی تھی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں دادی اماں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کا با تھا ایلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”اے ہے کیا ہے تمہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ لیکن اس کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ کچھ کھو گیا ہو۔ ایلی نے آہ بھری۔ ”اب مجھے کون تھپک کر سلانے گا۔“

دفعتاً اس کی نگاہ تلنے گھاس کی بزرگ ٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ شہزاد کا مختبسم چہرہ نمودار ہوا۔ پھولدار دوپٹے سے گورا چٹا بازو ویر آمد ہوا۔ ”میں جو ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں جو ہوں۔ تم مجھے بھول گئے کیا۔“

شہزادو کو دیکھ کر وہ ششد رہ گیا۔ ”ہائیں“ گھبرا کر اس نے شہزادو کی طرف دیکھا
شہزاد تو بالکل اس کے ذہن سے مفقود ہو چکی تھی۔ اسے اس کے وجود کا احساس ہی نہ
تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے علی پور میں رہنے کے باوجود واس کے ذہن میں شہزاد کا خیال
نہ آیا تھا اس نے محسوس کیا گیا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتكب ہوا ہو۔ علی پور میں ایک
دن رہنے کے باوجود اسے شہزاد کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ جیسے شہزاد اس کے لئے ایک دم
معدوم ہو گئی ہو۔ شہزاد کے گھر کی دیواروں کی طرف دیکھنے کے باوجود واس کی کھڑکی
کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود واس کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اپنی اس دیواری پر
وہ بوکھلا گیا۔ نہ جانتے وہ دل میں کیا کہتی ہو گئی وہ سمجھتی ہو گئی کہ اس روز اس کے بازو
پکڑ کر جو کچھ ایلی نے کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا مخفی وقتوں دل بہلاوا تھا۔
اس پر اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ شہزادوں میں کیا کہتی ہو گئی۔ اف ایلی نے
دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ شاید شہزادو اس کی آمد کا احساس
ہی نہ ہوا ہو۔ شاید اس نے ایلی کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا ہو۔ شاید اس کی وہ مسکراہٹ وہ
جملہ۔ ”تم لوگوں کی پرواکرتے ہو؟ ایلی تم؟“ مخفی ایک مذاق ہوا۔ پھر
اسے اس تمام واقعہ کی حقیقت پر شک پڑنے لگا۔ شاید یہ سب کچھ میرے دماغ کی
اختراع ہو۔ ورنہ شہزاد امیری پرواکرتے؟ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شہزادی انگلیں
حیینہ مجھے دنیا کے روپ و کھڑے ہونے کی شہزادے نہیں نہیں یہ سب خوش نہیں ہے۔
مخفی خوش نہیں!

یہ سوچ کر ایلی گھبرا گیا۔ اس کی گرد و پیش سر بنز کھیت ویران ہونے لگے سرسوں
کے پھول خزان زدہ پتے دکھائی دینے لگے۔ پھر دورا یک ٹیلے پر کھڑی ہو کر کوئی
مسکرانے لگی۔ اس کے بازا را ایلی کی طرف بڑھنے لگے۔ حتا مالیدہ ہاتھوں کی مٹھیاں
کھلیں۔ ”ایلی تم؟“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”تم ایلی؟“ وہ آواز گاڑی کے پہیوں میں

گوئیں گے۔ ایلی تم، تم ایلی۔ ” گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ساری کائنات پھولدار آنچل میں لپٹی جا رہی تھی۔

اکتاہٹ

بورڈنگ کی شکر پر نہر کے قریب اسے مہر اور نور ملے وہ دونوں بورڈنگ سے واپس آ رہے تھے۔ وہ دونوں ایلیں کے قریب سے گزر گئے۔ چار ایک قدم چلنے کے بعد وہ رک گئے مہر کھڑا ہو گیا اور نور ایلی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی خم تھا۔ آنکھوں میں وہی نگاہ تھی۔ جسے دیکھا رہا ہے نہادت سے زینین میں گردگیا مہر کیا کہے گا۔ وہ ایلی کے متعلق کس قدر غلط اندازہ لکھے گا۔

”آ گئے۔“ نور نے ترجیحی نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”ہا۔“

”کب آئے۔“ نور کی نگاہوں نے ایلی کے چہرے پر پنج گاڑ دیے۔
”ابھی۔“

”وہ مجھے ادھر آ نے نہیں دیتے۔“ اس نے شکایت کی۔

”کون؟“

”وہی۔“ وہ مسکرا یا۔ ” محلے والے۔“

”کیوں؟“

”پتھر نہیں۔“ نور نے ہونٹ بٹوہ سے بنائے۔

”اچھا۔“ ایلی چل پڑا۔

”وہ شکرتے ہیں۔“ اس نے ایلی کا راستہ روک لیا۔

”ہوں۔“ ایلی نے بے پرواہی سے کہا۔

”پھر؟“ نور نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم ان کے شکوک کو پورا

کیوں نہیں کرتے۔

”پھر کچھ نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا اور بورڈنگ کی طرف چل پڑا جیسے وہ نور کی بات سمجھا ہی نہ ہو، چاروں طرف اکتا ہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

آموں کی کوٹھی کے میدان میں بہت سے لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رسول سے پھلکوں کی بارش ہو رہی تھی۔

”آگئے بابو جی۔“ راموا سے دیکھ کر مسکرا یا۔ اس کے غلیظ دانت چمکے۔ کمرے میں آ صفحہاں میں سرویسے بیٹھا تھا۔ ”تم آگئے۔“ وہ ایلی کو دیکھ کر اولاد ادا نے سر اٹھایا اور تھہ بند جھاڑ کر کھینچ لگا۔ ”یہ تو جاتا آتا ہی رہتا ہے۔“ شفیع نے اللہ دادا کو دیکھا۔ ”بک نہیں دادا! اماں کی موت کو تو کیا جائے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اللہ دادا نے زیریں کہا۔ ”ناپنی کوئی دادی اور نہ اماں۔ وہ جو کشوے میں رہتی ہے ناخوشید بائی اس کے پاس گیا تھا۔ بہتری ملتیں کہیں کہ مجھے بیٹا بنا لو لیکن سالی نے بات سنی ہی نہیں الثامیر اشیوں سے کہہ کر مجھے باہر نکلا دیا۔ لو بولو۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔“

شفیع ہنسنے لگا۔ ”میں بتاؤں۔“ وہ بولا۔ ”بس چپ چاپ بیٹھا رہ تو۔“

اللہ دادا ہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد آ صفحہ اور ایلی چھل قدمی کے لئے باہر نکل گئے۔ فضا بے حد ادا س تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندر ہرے میں دھنڈلی سڑک ڈراؤ نا منظر پیش کر رہی تھی۔ چپ چاپ وہ دونوں کمپنی باغ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ وغذا آ صفحہ گویا اس خاموشی سے اکتا کر بولا۔ ”اے ایلی۔“

”جی۔“ ایلی نے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔

”میرا کیا ہو گا ایلی۔“

”کیوں؟“

”میرا نجام کچھا چھا معلوم نہیں ہوتا۔“ وہ بولا۔
”خواہ خواہ۔“

”خواہ خواہ نہیں۔“ آصف نے کہا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں۔“

”کیا محسوس کرتے ہوئے۔“

”جیسے جیسے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔“

”آخربات تواتری ہےنا کوہ آگئی ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ آصف نے آہ بھری۔

”پھر؟“

”اس کی بات نہیں۔“

”تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟“

”میں کہتا ہوں۔ یہ کیا مجھے شگ کیوں کرتی ہیں؟“ اس نے آہ بھر کر پوچھا۔

”شگ تم خود ہوتے ہو آصف۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ نہیں کرتیں۔“

”تمہیں نہیں معلوم۔“ آصف نے جواب دیا۔ اب دیکھونا کتنی بدناگی ہو رہی ہے میری نہ جانے اس نے وہاں گھر میں کیا طوفان بپا کر رکھا ہے۔ اماں کیا کہتی ہوں گی اور پھر محلے والے وہ تو پہلے ہی کہتے تھے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔“

”تو انہیں کہنے دو تمہارا کیا جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”نہیں نہیں۔“ آصف چلایا۔ ”تم ایسا نہ کہا کرو۔“

”تو بتاؤ کہ میرا کیا ہو گا؟“ آصف نے پھر آہ بھری۔

”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی چڑھ گیا۔

”نه جانے کیا ہو گا؟“ آصف نے ہاتھ مل کر کہا۔ کچھ دیر کے لئے وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے پھر آصف نے بات بدلتی۔

”ایلی۔“ وہ بولا۔ ”تم تیم سے نہیں ملے؟“

”تیم۔“ ایلی چونک پڑا۔ وہ تیم کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

”مجھ سے چھپاتے ہو۔“ آصف ہمسا۔

”نہیں تو۔“ ایلی نے کہا۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دل میں آئی کا صفحہ سے شہزادی کی بات کہہ دیے لیکن اس میں جرات نہ ہوئی۔ آصف سے بات کرنا ممکن نہ تھا ایلی محسوس کرتا تھا۔ جیسے طبعی رنتیقی کے باوجود آصف ایک موتو تھا۔ جس سے دل کی بات نہ کبی جامکتی تھی۔

اگلے روز کالج سے فارغ ہو کر ایلی آغا کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کوچے سے بے حد دلچسپی تھی، ان چہروں سے تو اسے قریکا تھا جو کھڑکیوں اور جنگلوں میں بنے سورے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن لڑکے والیوں کی لوچدار آوازیں سن کر ایلی کے دل پر سانپ لوٹ جاتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی کاچھہ مسل رہا ہو۔ اس میٹھی جلن میں کس قدر لذت تھی۔ پھر جب سارگی کسی ایک چوبارے میں بین کرتی اور طبلہ سر پینتا تو ایلی پر کیفیت طاری ہو جاتی۔

ابھی وہ چوک میں ہی تھا کہ جی نہ جانے کہاں سے آ دھما۔ ”ارے تم ایلی؟“ وہ چلایا۔ ”تم تو جیسے کھو گئے۔ کیا ہوا تمہیں۔“

”داوی اماں فوت ہو گئیں تھیں۔“ ایلی نے روئی آواز میں کہا۔

”اوہ۔“ ایک ساعت کے لئے جی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ مخصوص انداز سے مسکرانے لگا۔ ”داوی اماں میں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔ ان کی توانات ہی ایسی ہے اب چھوڑو بھی۔ تم نے تو ایسا حال بنارکھا ہے۔ جیسے دنیا تیاگ دو گے۔ آ تو تمہیں اپنی حاشق کے پاس لے چلوں۔ اسے دیکھ کر سب کچھہ بھول جاؤ گے۔ شرط لگا لو۔ نہ بھولو۔ تو اپنا ذمہ۔ میں اپنے دکھو ہاں اٹھا کر لے جاتا ہوں اور وہ ایسی اچھی ہے کہ ایک نظر دیکھ لے تو سب بھول جاتا ہے آؤ۔“ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ جی اسے زبردستی

ساتھ لے جائے لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں ڈرچھپا ہوا تھا۔
”نہیں نہیں۔“ وہ جھگ کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی وہ ڈرہا تھا کہ کہیں حتیٰ اس کے
احتیاج کو تسلیم نہ کر لے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر چلانہ جائے۔ لیکن حتیٰ اسے کھینپتا ہوا
چوبارے پر چڑھنے لگا۔
بائی اور ”جھٹا۔“

پھر زینے میں حتیٰ نے آواز دی۔ ”ہے نا۔ ادھر آؤ بھاگ کر میں ایک شخص کو پکڑ
لایا ہوں۔ بھاگ نہ جائے دوئ کر آؤ نا۔“ وہ چلاتا گیا۔
”ہے نا۔“ کوڈیکھر ایلی جیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رقصہ کی طرح بنی
سنوری ہوئی عورت ہوگی، اس کے پیڑوں میں وہی بھڑک ہوگی۔ اس کے بال
ویسے ہی بنے ہوں گے۔ ان سے خوبی پیش آتی ہوں گی۔ لیکن وہ تو گویا باور پی
خانے سے وال بھگارتی ہوئی اٹھ کر آئی تھے۔ پڑے عام سے تھے۔ جن میں اجلاء
پن نام کو نہ تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ آستینیں یوں اور پر چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے روز
پڑے ڈھوتی ہو اور چہرے پر جوانی کی شکافشگی کے سوا سنگار کا کوئی عصر نہ تھا۔ وہ
بھاگی بھاگی آئی اور سوچے سمجھے بغیر ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے لگی۔ ایلی نے اس کی
طرف جیرانی سے دیکھا۔ وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے صد یوں سے اسے جانتی ہوا اور
اس کا جسم یوں بے تکلفی سے ایلی سے چھوڑ رہا تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو۔

پھر چند ہی منٹوں میں وہ ایلی کے پاس ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی بلا تکلف
باتیں کر رہی تھی۔ ” حتیٰ نے مجھے کئی بار تمہارے متعلق بتایا ہے۔ حتیٰ کہتا کہ تم اس کے
دوست ہو۔ مجھے حتیٰ کے سمجھی دوست پیارے ہیں۔“ وہ مسکرائی اور پھر ہم۔ ہم نام
بھی تو ہیں۔ تم الیاس ہو اور میں الماس کچھ زیادہ فرق تو نہیں۔ ہے نا تو حتیٰ مجھے پیار
سے کہتا ہے میرا اصلی نام تو الماس ہے۔“

”بکتی ہے یہ۔“ ” حتیٰ چلایا۔ ”الماس ولماں کوئی نہیں یہ۔ وہ تو نمائشی چیز ہوتی

ہے۔ یہ ہے نا تو خالص گھر کی رانی ہے۔ کیوں ایلی؟“

”ہاں۔“ ایلی نے اثبات میں سر ہلاایا۔

”کیوں ایلی۔“ حمی نے پوچھا۔ ”ہے نا الماس بائی ہو سکتی ہے کیا؟“

”ہے نا۔“ کی آنکھیں پر شم ہو گئیں۔ مسکرائی۔ ”گھر کی رانی کو سمجھی کچھ میسر ہے ایک گھر غیر میں۔ اور نہ ہوگا۔“ اس کے گالوں پر آنسو ڈھلنے لگے۔

”پاگل پاگل۔“ حمی غصے سے چینخے لکا۔ ”پھر وہی حماقت۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ہے نا نے آنسو پیٹھے ہوئے کہا۔ ”میرا دل کو اسی دیتا ہے کہ گھر نصیب نہ ہو گا تم چاہے لا کھکھو۔“

”میں کہتا ہی کیا ہوں۔“ حمی ہنگامہ۔

”چاہے کہو بھی۔ لیکن جو لوگ ہاہے ہو کر رہتا ہے یہ چند دن تو میں گھر بنانا کر رہ لوں گی پھر چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ چند روز۔“ اس کی آواز بھر آئی۔ ”ایلی تم بھی یہاں میرے پاس رہو۔ رہو گے؟ چند روز تو ہیں۔ صرف چند روز پھر ایک دن الماس بائی کو چوبارہ میں جانا ہی پڑے گا۔“ ہے نا نے کھسپائی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ وہ ہیں جا بیٹھے گی جہاں سے آئی ہے۔“ ہے نا نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”پاگل۔“ حمی چلا یا۔

”کیوں ایلی رہو گے میرے ساتھ؟ جب حمی چلا جاتا ہے تو یہ گھر ویران ہو جاتا ہے، پھر میں اکیلی بیٹھی گھبرا جاتی ہوں۔ تم آ جاؤ تو ہم اکٹھے رہا کریں گے تمہیں بہت سے باتیں سنایا کروں گی میں..... بہت سی آؤ گے نا؟“

”میں میں۔“ ایلی گھبرا گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے ہے نا کے پاس آ رہے ہو وقت چار پانی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی باتیں سن کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے

اور قریب اور قریب اپنے سر اس کے زانو پر رکھ کر سو جائے۔ اسے اپنی اس خواہش پر ندامت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ خواہش اس کے دل سے نکلتی نہ تھی۔

دفعاً کشوے میں شورستائی دیا۔ حتیٰ تراپ کرناٹا۔ ”کیا ہے کیا ہے؟“ وہ چلایا۔

”ہونا کیا ہے۔“ ہے نابولی۔ ”وہی جو اس بازار میں ہوتا رہتا ہے اور کیا۔“

”کیا ہوتا رہتا ہے یہاں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”دیکھو چلا کر۔“ وہ بولی۔ ”چلو۔“

”یہاں تو بھیر گئی ہے۔“ ایلی نے بازار میں جھاگ کر کھا۔

”وہ تو لگی ہی رہتی ہے۔ یہ بازار بولل کی طرح چڑھ جاتا ہے۔“ وہ بولی۔

”ہے نا ہے۔“ حتیٰ دوسری کھڑکی میں سے چلا�ا۔ ”سامنے روپ گرفتار ہو گیا۔“ ”ہا میں“ ہے نانے سینہ تھام لیا۔ ”وہ سیٹی بیٹھ والا راجا گرفتار ہو گیا کیا۔“ ”ہاں“ حتیٰ بیٹھیوں کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔ ”وہی۔ میں ابھی آیا۔“ اور پھر زینہ اترنے لگا۔

”ہے نا کھڑکی میں ایلی پر جھک گئی حتیٰ کہ اس کا تمام تر جسم ایلی سے چھونے لگا۔ ایلی نے جیرانی سے ہے نا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں نیچے دیکھ رہی تھی اسے احساس ہی نہ تھا کہ اس کا جسم ایلی سے مس ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر وہی پا کیزگی وہی گھر کی دیوی پن واضح تھا لیکن ایلی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس جھکی ہوئی عورت کا دودھ پیتا بچہ ہو جسے اس نے چھاتی سے لپٹا رکھا ہو۔

دفعاً ہے نانے محسوس کیا کہ ایلی سمنا جا رہا ہے۔

”ہیں یہ تم سمعے کیوں جا رہے ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”تم بہت قریب ہونا اس لئے۔“ ایلی نے ڈرتے ڈرتے اسے چھیڑا۔

”تو پھر کیا ہوا۔“ وہ بُشی اور اس نے ایلی کو دونوں ہاتھوں سے آغوش میں لے کر بھینچ لیا۔ ”تم تو ہمارے اپنے ہو۔“ وہ یوں بولی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو آغوش میں لے کر اس کامنہ چوم لیتی ہے۔

یہ محسوس کر کے ایلی احلاں نہامت میں ذوب کیا اور ہے ناپھر سے اس کے وجود سے بے خبر ہو گئی۔

”یہ سیئی والی بھین والا کامونہہ میرے پاس بھی آیا تھا۔ سمجھتا تھا کہ ڈر جائے گی۔ مگر میں کیا سمجھتی ہوں ایسون کو۔ وہ ڈانٹا میں نے کچھ بھی میرے گھر کا رخ نہیں کیا۔“

”لیکن اسے قید کیوں لے رکیا گیا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کچھ کر دیا ہو گا نہیں۔“ وہ بولی۔ ”کسی کو قتل نہ کر دیا ہو۔“

اسی وقت ایک ساعت کے لئے ”ہے نا“ کی جگہ باالی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اس نے دونوں ہاتھ اپنے کو ہدوں پر رکھ لئے۔ ہونٹ بٹھ سے بن گئے اور آنکھ میں چمک لہرائی۔

”سمجھتا تھا۔“ وہ بولی۔ ”کہ اسے بھی دھمکی دے کر گرالوں گا..... بلا اپنا تھا۔“

ایلی الماس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”ہے نا۔“ وہ بولا۔ ”پانی پلاو گی۔“ ”پانی۔“ وہ چونک پڑی اور دفتارا بائی کی جگہ ہے نا مسکرانے لگی۔ ”تم بھی مجھے تنگ کرنے لگے ہو۔“ وہ چلائی اور اندر جادا خل ہوئی۔

”ایلی یہاں آؤ۔ یہاں نیچے بازار میں۔“ ”جی چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ الماس کے چوبارے میں تھا۔ اسے شرم آنے لگی۔ گھبرا کر کھڑکی سے پیچے ہٹ گیا اور پھر دفتار اسے خیال آیا کہ جی کو خاموش کرنے کے لئے اسے نیچے جانا ہی پڑے گا۔ جب وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو ہے نا بھاگی

بھاگی آگئی۔

”یہ لو اپنا پانی۔“ وہ بولی اور اپنے آپ کو یوں سنبھالنے لگی۔ جیسے گاؤں کی الہر گوریاں بھاگنے کے بعد تھک کر آنچل اور اپنا آپ سنبھالتی ہیں۔

”میں جارہا ہوں۔“ ایلی نے کہا اور زیستہ اتر نے لگا۔

”پھر آؤ گے نا۔“ وہ بولی۔ ”ضرور آنا۔ میں یہاں اکیلی بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہوں۔ ضرور آنا۔ ضرور۔“ اس کی آواز گونج رہی تھی اور ایلی بازار میں پہنچ چکا تھا۔

انوکھی تحقیق

کشوں میں بھیر لگی ہوئی تھی۔ لوگ جلد گزر ہوں میں کھڑے با تین کرہے تھے۔ پنوائیوں کی دو کافوں پر لوگ جمع تھے۔ پان کی پیک تھوک کریا سگریٹ کا المباکش لگا کروہ بار بار سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف دیکھتے اور پھر چہ میگویاں کرنے لگتے۔

چوباروں میں رقصائیں منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھیں اس وقت انہیں بناو سنگھار کا ہوش نہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے بال پر بیشان ہو رہے ہیں۔ چہروں پر تھکن کی جھریاں پڑی ہیں۔ گال پاؤڑا اور روغن سے خالی ہیں یا پاؤں نگے ہیں۔ غالباً اس وقت انہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ رقصائیں ہیں۔ اس وقت تمام بائیاں ہے نابنی ہوئی تھیں۔ جیسے دفعاً باور پی خانے سے کام کرتے کرتے بھاگ کر جنگلے میں آ کھڑی ہوں۔

وہ سب حیرانی سے سبز جنگلوں کے مکان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سبز جنگلے ویران پڑا تھا۔ بازار میں لوگ حیرانی سے چلا رہے تھے۔

”بھی حد ہو گئی۔ وہی سیٹی ٹیڈی والا راجہ..... حد ہو گئی۔“ ایک بولا۔

”سالہ خومت کرتا تھا یاں کشوں پر۔“

”حکومت سی حکومت سناء ہے سیٹھے جمنا داس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کے

”بھی کیوں نہ جوڑتا۔ دل کا معاملہ تھا۔“

”سیٹی بیٹی والا چاہتا تو سالہ چار موڑ کاریں مانگ لیتا۔ سیٹھے سے۔“

”موڑ کیا ہے جو چاہتا رسولیت ہاں۔“

”پر اسے تو میاں شادی کے سوا کچھ سو جھتنا ہی نہ تھا۔ وہ اس کے سر پر سوار تھی۔“

”وہ شادی سالی ہے بھی تو بندوقل چڑھ جاتی ہے ایک دم۔“

”پر اب تو بایوکھل گئی وہ بندوقل۔ کیوں بھی۔“

”پر مالم کیسے ہوا پبلوان کو کہ سالہ ویسے ہیں رلاجہ ہنا ہوا یہ بھوٹ موٹ کا۔“

”بس ہو گیا۔ کامنگی ہشیدیا۔ اسکب تک چھٹیا ہے ہاں۔“

”بھی ہشیدیا تو آٹھ مہینے چڑھی رہی۔ میرے بھائی۔“

”اور میں کہتا ہوں یہ تو چڑھی ہی رہتی اگر اپنے بابو کی بنی کون چھیڑتا وہ۔“

”کون بنی؟“

”اُرے یہی سبز جنگلے والی۔“

”وہ جو سانوری سلوٹی سی ہے؟“

”ہاں ہاں بڑی مرچیلی ہے وہ۔ بابو اس کے ہاں آتا جاتا ہے نا۔“

”کون بابو؟“

”بابو کو نہیں جانتے۔ بھی وہ گورا چٹا۔ نہیں کشوے میں رہتا ہے۔ سرداراں کے چوبارے کے پچھواؤڑے کی گلی میں کھفیہ پولیس میں ہے وہ بابو اپنا۔“

”لیکن کیسے معلوم ہوا کہ سیٹی بیٹی والا بناوٹی افسر بن کر تحقیق کر رہا ہے۔“

”بس جی بابو نے پہلے تو اس بھروسے کی ملتیں کیں۔ تم جانتے ہو کہ ایک مجھے کے آدمی ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہیں اپنے بابو نے کہا۔ بھی جس پر جی چاہے ہاتھر کھڑا اپنے کو کچھ تعلیع نہیں پر ”بنی“ پر ہاتھ نہ ڈالنا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”بات تو کھری کہی بابو نے پیارے۔“

”ہاں بھی صاف بات اچھی ہوتی ہے۔“

”پروہ تو گویا نفلوں کا بھوکا تھا۔ اسی شام کو وہ بُنیٰ“ کے چوبارے پر چڑھ گیا اور بابو خون کے گھونٹ پی گزرا گیا۔ پھر بابو نے جا کر ففتر سے مالوہات لیں۔ اس سے پوچھا اس سے پوچھا پوری تجھ کی اور مالوہم ہوا کہ سرکار نے قبیش کے لئے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور بُس صاحب آج بابو میاں دو خان پر آیا اور بولا استاد آج کہیں سرکنا نہیں وہ تماشہ دکھاؤں گا کیا یاد کرو گئے ایسا تماشہ کشوے والوں نے کبھی نہ دیکھا ہو گا اور اس وقت وہ اپنی بُنیٰ کے چوبارے میں ہے اور ساتھ پلس ہے تاکہ سیٹی پلیٰ والے کو تھکری لگا لے۔“

”ہوں تو یہ بات ہے۔“

”بھی شاشے بابو کا۔“

”بڑا مجھے کا آدمی ہے وہ اگر چہ ہے کھفیہ پلس کا پر اپنا یار ہے۔“

عین اس وقت آغا آگیا۔ اس کے چہرے پر وہی بے نیازی برس رہی تھی۔

”تم ہوا میں؟“ آغا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سری انداز سے بولا۔ ”آ گئے تم۔ اب کی مرتبہ تو دیر کر دی تم نے یہ تماشہ دیکھاحد ہو گئی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ انکو اری محض ڈھونگ ہے اور وہ سی آئی ڈی کا اسپنڈ دراصل ایک موقوف شدہ پلیے ہے۔ پٹھے نے آٹھ مہینے کشوے میں عیش کئے ہیں۔ دعوییں اڑائی ہیں۔ مجرے دیکھے ہیں۔ گانے سنے ہیں اور جس کی تیج پر چاہا لیٹا ہے۔ خدا کی قسم ایسا ستم ظریف تھا کہ چوٹی کی بائیوں سے چل میں بھرواتا رہا۔“ وہ ہٹنے لگا۔

”لیکن۔“ میلی نے پوچھا۔ ”پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”ہاں۔“ آغاہنسا۔ ”میں سمجھا شاید تم جانتے ہو اس معاں ملے کو کثرے کا تو پچھے بچے
جاننا ہے۔“ آغاہنسنے لگے۔

”کیا واقعی۔“ ایلی نے کہا۔

”یہ سیٹی پینڈ والا انسپکٹر پہلے پولیس میں تھا۔ پھر نہ جانے کس وجہ سے برخواست
ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے ایک جعلی حکمنامہ بنایا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں
شخص نے حکومت کا ایک لاکھ روپیہ غیر بن کیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے زیادہ
تروپیہ امر تسریخ رکھیں میں اپنی محبوبہ بنام سروارہ یا بھارو پر صرف کیا ہے۔ انسپکٹر
روف کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقعہ پر جا کر ان امر کی حقیقت کرے اور اپنی رپورٹ
پیش کرے۔“ آغا صاحب نے لکھا۔

”مکجھت کو کیا بات سمجھی اور پھر اس نے رقصاؤں کے جودو نام لکھے اس خط
میں وہ بہت سوچ کر لکھے۔ چونکہ کثرے میں ان ناموں والی بہت سی رقصاؤں میں
ہیں اور وہ سب اوپر کے درجے کی ہیں۔ بس تو اس نے وہ خط یہاں کے ایسی پی کو
دکھایا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس کے بعد اس نے قنیتیش کے پردے میں
وہ کیا جس کا جواب نہیں۔“

”آخاہ آخاہیں۔“ ایک نوواروان کی طرف بڑھا اور وہ دونوں باتیں کرتے
ہوئے سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف چل دیئے۔

ایلی نے آغا کی ڈیورٹھی کی طرف دیکھا وہاں نیم کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نیم کو اپنے
خصوص انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر ایلی کا دل ڈوب گیا۔ معاں سے خیال آیا
شاید تیم بھی وہیں موجود ہوگی۔ وہ تڑپ کر مرہ اگر آغا کے چوبارے کی کھڑکیاں
جوں کی توں بند تھیں۔ چھپیں بے جان انداز سے لٹک رہی تھیں اور حرکت سے قطعی
طور پر بے گانہ تھیں۔ اوپر کوٹھے کی منڈیر پر سریا بازو کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ دے رہا
تھا۔ ایک بار پھر اس پر مایوسی چھاگئی۔ اس نے نیم کی طرف دیکھا جو وہیے ہی کھڑی

مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی خوبخبری اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی ہو۔

بادب باملاحظہ ہوشیار

ایلی نے آغا کی طرف دیکھا وہ دور جا چکا تھا۔ جنی پان کی دکان پر کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ اس نے وہ ایک مرتبہ ادھر ادھر دیکھا اور پھر حالات کو سازگار سمجھ کر نیم کی طرف بڑھا۔ اس سے آتے دیکھ کر نیم کے ماتھے پر پیارا شکن پڑ گیا۔ بھویں کمانوں کی طرح ہوتی گئیں۔

”ہم نہیں بولتے تم سے۔“ وہ ایک اندازتے زیر لب بولی۔

”کیوں؟“ ایلی نے نہایں چکراتے ہوئے لہا۔

”بس تم نے کھو دیا۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

”کیا کھو دیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”سب کچھ۔“ وہ بولی۔ ”تم تو بس کھوہی دیتے ہو۔ میں بناتی ہو بات اور تم بگاڑ دیتے ہو۔

”آخر بتاؤ بھی نا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر تم آتے کیوں نہیں ہمارے یہاں۔“ وہ بولی۔

”تمہاری آپا جو چھپی رہتی ہے۔“ اس نے پینترہ بدلا۔ ”دیکھ لو آج بھی چھپی بیٹھی ہے۔“

”اوں۔“ وہ بولی۔ ”وہ تو نہیں چھپتی پر دادی اسے باہر آنے بھی دے۔“

”کیوں دادی کیا پکڑے رکھتی ہے اسے۔“

”سائے کی طرح سوار رہتی ہے۔ آپا کہتی تھی.....۔“ وہ رک گئی۔

”میرے متعلق کچھ کہتی تھی۔ بتاؤ۔“ ایلی نے منٹ کی۔

”نہیں بتاتی۔“ اس نے بسور کر کہا۔ ”مجھ سے ملتے جو نہیں تو بتاؤ کیوں۔“

”تم بڑی پیاری ہو۔“ وہ اس کے قریب تر ہو گیا۔

”جھوٹ۔“ نیم نے اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑو ہمیں۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ چھوٹی سی لڑکی درحقیقت ایک بالغ عورت ہو۔ ایک عورت جو بھانے کے انداز سے پورے طور پر واقف ہو۔ اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نیم نے اس حوالکی کے باوجود اپنا منہ موڑ رکھا تھا۔

عین اس وقت ایک شورا تھا اور کشوے میں کھڑے تمام لوگ بزر چنگے والے مکان کی طرف بھاگ کے۔ ”ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔“ جی نے بڑھ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ اسے نیچے لارہے ہیں۔“ جی ایلی کو دیوانہ وار گھینٹنے لگا۔

وہاں ایک کھرام بچ گیا۔

”جوتے مارو جوتے۔“

”کھال ہے بہرو پی؟“

”پکڑ لیا کیا۔“

”اسے لارہے ہیں۔“

”پہلو ان ذرا دیکھنا دو کان کو میں آیا۔“

سب لوگ دیوانہ وار بزر چنگے والے چوبارے کی طرف لپکے۔ جی نے دو ایک کو گرایا دو ایک کو پچھاڑا اور وہ دھاڑتا ہوا ایلی سمیت بزر چنگے والے چوبارے کی سیڑھیوں کے سامنے جا پہنچا۔ چند ایک سپاہی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ جگوم کو دیکھ کر انہوں نے اپنے چاک بک چلانے شروع کر دیئے۔ ”ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔“ لوگوں نے بڑی مشکل سے راستہ دیا۔ جی یہ دیکھ کر اس دو کان کی طرف لپکا جوان سیڑھیوں سے ملحتہ تھی اور اس نے ایلی کو چھجھ پر گھسیٹ لیا۔

سپاہیوں کے پیچھے سیٹی بھیں والا روپ تھکڑی پہنے بڑے وقار سے آ رہا تھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ اس نے بڑے غیور انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر بار عرب انداز سے بولا۔ جیسے اپنی رجمنٹ کو حکم دے رہا ہو۔

”اے ہمارے لئے موڑ بھی نہیں لائے تتم۔ ہم موڑ کے بغیر کیسے جائیں گے؟“

بابو نے ایک زبرخند مکرراہنگ سے اسکی طرف دیکھا۔ سپاہی مسکرائے۔

”اور دیکھو،“ ملزم نے تحکمانہ الجہ میں کہا۔ ”ہمیں سکریٹ چاہئیں پہلوان۔“

وہ چلایا۔ ”سکریٹ کا ایک ٹین۔“

”سکریٹ کا نہیں۔ پہلوان پیرواؤ کی چلایا۔“ اب تو بیٹھے ویسے ہی ٹین پاٹ ہو

گا۔“

”سالا موڑ مانگتا ہے۔“ جوم سے آواز آئی اچل تو سہی تھانے میں تیر انکسیلپر دبائیں گے تو ہوش آجائے گا۔“

”اے او سیٹی والی بیٹھی۔“

”خاموش۔“ ملزم نے انہیں ڈانگا۔ ”ہمیں نہیں جانتے تم۔“

بابو ہنسنے لگا۔ ”اب سالا دیوانہ بنتا ہے۔“

”بکار خوبیش ہشیار ہے۔“

وہ جلوس آہستہ آہستہ کشوے میں چلنے لگا۔ جوم نعرے لگا رہا تھا۔ لوگ بیڑیوں کے گلزارے اس معزول شدہ راجہ پر پھینک رہے تھے۔ اوپر رقصائیں جنگلوں نے نیچے لگلگی ہوئی تھیں کئی ایک ہاتھ مل رہی تھیں۔ کئی ایک شرمندگی محسوس کر رہی تھیں کہ انہیں دھوکہ دے کر لوٹ لیا گیا اور وہ سیٹی بیٹھی کامتوالا تحکمانہ انداز سے احکامات جاری کرتا ہو چلا جا رہا تھا۔

”ہٹ جاؤ یہ ہمارا جلوس ہے با ادب بالا حظہ ہوشیار۔“

اس روز شام کو جب ایلی واپس اپنے بورڈنگ ہاؤس کو جا رہا تھا تو وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود سیٹی بیٹھی کا بہرہ پیسہ ہوا ایک روز اسے بھی یونہی جلوس میں چلتے ہوئے

پکارنا ہوگا ”بادب باملاحظہ ہوشیار۔“

الوداع

پھر وہ سب امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ شفیع صحیح سوریہ سے ہی اپنی ہاکی سٹک اور کتابیں اٹھا کر قریب کے باعث میں جا بیٹھتا اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاہل میں وقت کا فتا۔ آصف اور رایلی نہر کے کنارے جا بیٹھتے۔ جہاں آصف پڑھنے کے علاوہ سخنداں آئیں بھرتا اور بار بار رایلی سے پوچھتا ”ایلی اب کیا ہوگا؟“ اور رایلی یہ سن کر سونے لگتا اس وقت اس کے روپ و شہزادہ کھڑی ہوتی اس کے ہتھ میں ایک ریلکن میں آواز سنائی دیتی۔ ”ایلی تم، مجھے تم سے یقین تھیں؟“ ”ایلی اب کیا ہوگا؟“ آصف کی آواز سنائی دیتی اور پھر رایلی کے سامنے وہ سیٹھی کا دیوانہ آ موجود ہوتا اور تحکماں انداز سے چلاتا ”بادب باملاحظہ ہوشیار۔“

اللہ داؤ سارا دن کمرے میں بیٹھا رہتا اور پڑھنے کے علاوہ سر پر آم کی چھٹھی رگڑتا رہتا اور پھر با آواز بلند بیگانی بابو کو گالیاں دیتا جس کی وجہ سے وہ گوشت کھانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

”ان ہندوؤں کو اللہ غارت کرے یا مہاتما بدھ ان پر اپنا قبر نازل فرمائ کہ انہوں نے ایک سچے مومن پر گوشت کھانا حرام کر رکھا ہے۔“

”رام ان کو بن باس دے کہ انہوں نے مجھے دال کھلا کھلا کر تباہ کر دیا ہے میرا معدہ ہر وقت لا حول پڑھتا ہے۔“

اللہ داؤ کا شور سن کر ہر نام اور لینا سیاں آ جاتے اور وہ سب مل کر شور مچاتے۔ ہوشی کا بیگانی سپر غنڈٹھت اللہ داؤ کی بد دعا میں سنتا اور چوری چوری مسکراتا کیونکہ وہ خود مظلوم تھا۔ سجاو والوں نے اس پر بھی چھٹھی کھانے کے خلاف پابندی لگا کر کھی تھی۔ جب وہ سب امتحان سے فارغ ہوئے تو اللہ داؤ نے سکھوں کے ساتھ مل کر

بورڈنگ میں ایک جلوس نکالا۔ وہ جلوس تین لڑکوں پر مشتمل تھا ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ، اللہ داد خود اس جلوس کا لیڈر تھا۔ وہ ہر کمرے میں جا کر نعرہ لگاتے۔

”جے ہندو دھرم کی جے۔“

”اے بندوو۔“ اللہ داد چلاتا ”خدا تمہارا کلیاں کرے۔ تم نے سال بھر ہمیں والیں کھلا کھلا کر اندر بابہر سے خوشبو دار بنایا ہے۔“ اس پر باقی لڑکے چلاتے۔

”جے ہندو دھرم کی جے۔“

اللہ داد کے غرے سن کرسوئی کے تمام نو گھرست سے سر ہلا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ واقعی اندر بابہر سے خوشبو دار ہونا ایک قابل تعریف امر ہے۔ ہندو جذبات کے اثر سے بھیکی ہوئی تھیں بھرپر نکال ہوں تھے اللہ داد کو دیکھ رہا تھا۔ دور بنا کی بابو زیری رب مسکراتے ہوئے ہل رہے تھے۔ اور آصف اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا ایلی کے کان میں کہہ رہا تھا ”اب کیا ہو گا اب میں گھر کیسے جاؤں گا ایلی؟“

عین اس وقت پرنسپل اپنی لینڈو میں آموں والی کوٹھی میں آ دھما کا۔ چند ایک ساعت کے لئے پوتوں کے پیچھے چھپ کرو ہ لڑکوں کی باقی سنتا رہا پھر معاملہ کی نوعیت کو بھانپ کر مسکرا یا اور وہیں سے چلانے لگا۔ ”او اللہ داد یہ کیا شور ہے؟“ جلوس پرنسپل کو دیکھ کر ہتم گیا۔ سکھ دفعتاً اپنے کھلے بالوں میں گلکھی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ رامو اور لا لو بھاگ کر رسولی میں برتن صاف کرنے لگے۔ اللہ داد ایک ساعت کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا اور پھر اسے سوچی۔ اس نے جیب سے آم کی خشک گلخانی کی اور اسے اپنے سر پر رگڑنے لگا۔

”کیا کر رہے ہو اللہ داد۔“ پرنسپل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”سلام پرنسپل جی۔ سر سے خشکی نکال رہا ہوں۔“

”ہوں۔ لیکن تمہاری سر کی خشکی کبھی نہ جائے گی۔ خشکی آم کی گلخانی سے نہیں جاتی عقل سے جاتی ہے۔“ اس پر سب لڑکے نہ پڑے۔